جلد ۵ عدد ۶

ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ

رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲۰

رجسٹر نمبر ایم (۴۹۵۰)

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)

قیمت فی پرچہ ۵ر

ایکہزار روپیہ نقد کے انعامات میں مدت کی توسیع

ایک انعام سو روپیہ دو انعام ۵۰ روپیہ۔ چار انعام ۲۵ روپیہ آٹھ انعام ۲۰ روپیہ سولہ انعام ۱۰ روپیہ اور ۷۲ انعام پانچ پانچ روپیہ کے اس طرح جملہ ایک ہزار روپیہ کے ایک سو تین انعامات الاعظم کے ان خریداروں میں تقسیم ہوں گے جو یکم شہریور ۱۳۴۴ف م آخر جون ۱۹۳۵ء سے پہلے ایک سال کے لیے خریدار بن کر چھے روپیہ روانہ کردیں گے انعامات کی تقسیم قرعہ اندازی سے ہوگی اور ایکہزار خریداران کی تکمیل ضروری ہے جس کے لیے مدت میں توسیع کی گئی ہے اگر اب بھی تکمیل تعداد نہ ہوگی تو اسی تناسب سے انعامات کی رقم کم کردی جائے گی۔ بہرحال ہر دس خریداروں میں ایک کو انعام ملنا ضروری ہے آپ کے روانہ کردہ چھے روپیہ میں انعامات کے علاوہ سال بھر تک ہفتہ وار الاعظم اور ماہانہ الاعظم آپ کو ملے گا ہفتہ وار اخبار ٹیمس سائز کے (۲۰) صفحہ پر اور ماہانہ (۶۸) صفحہ پر شائع ہوتا ہے ہفتہ وار میں مملکت آصفیہ کے چپہ چپہ کی خبریں حیدرآباد عالم اسلام اور ممالک غیر کی تمام اہم خبریں افسانے نظمیں اور تمام وہ دلچسپیاں ہوتی ہیں جو آپ کو دکن کے کسی اخبار میں نہیں مل سکتیں اسی طرح ماہانہ الاعظم آپ کو ملک کے تمام ادبی رسائل سے بے نیاز کردے گا جس میں ملک و بیرون ملک کے مشہور اہل علم و قلم اصحاب کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ بہرحال بہ حیثیت مجموعی صرف چھ روپیہ سالانہ میں آپ کو سال بھر ایک ہفتہ وار اخبار۔ ماہانہ ادبی رسالہ کیساتھ ملے گا۔ گراں قدر انعامات بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ پس دیر نہ کیجیے اور پہلی فرصت میں چھ روپیہ منی آرڈر سے روانہ کردیجیے یا پہلے ایک کارڈ لکھکر اخبار و رسالہ کا نمونہ مفت طلب فرماکر دیکھ لیجیے

منیجر الاعظم ثریا بلڈنگ پتھرگٹی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ جلد ۵ عدد ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

قرآن مجید میں ایک قاعدۂ کلیہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے کہ کسی قوم کو خواہ مخواہ برباد کر دے درانحالیکہ وہ صالح اور نیکوکار ہو۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱ : ۱۰)

اور تیرا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے نیک عمل کرنے والے ہوں۔

ہلاک اور برباد کر دینے سے مراد صرف یہی نہیں کہ بستیوں کے طبقے الٹ دیے جائیں، اور آبادیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے، بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قوموں کا شیرازہ بکھیر دیا جائے، ان کی اجتماعی قوت توڑ دی جائے، ان کو محکوم و مغلوب اور ذلیل و خوار کر دیا جائے۔ قاعدۂ مذکورہ کی بنا پر بربادی اور ہلاکت کی جملہ اقسام میں سے کوئی قسم بھی کسی قوم پر نازل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خیر و صلاح کے راستے کو چھوڑ کر، شر و فساد اور سرکشی و نافرمانی کے طریقوں پر نہ چلنے لگے اور اس طرح خود اپنے اوپر ظلم نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر جہاں کہیں کسی قوم کو مبتلائے عذاب کرنے کا ذکر فرمایا ہے، وہاں اس کا جرم بھی ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے، تاکہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ ان کی اپنی ہی شامت اعمال ہے جو ان کی دنیا اور آخرت دونوں کو

خراب کرتی ہے فَکُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِہٖ ..... وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظْلِمَھُمْ وَلٰکِنْ کَانُوْٓا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ ۔ (۲۹: ۴) ۔

دوسری بات جو اس قاعدہ سے نکلتی ہے، یہ ہے کہ ہلاکت و بربادی کا سبب انفرادی شر و فساد نہیں ہے بلکہ اجتماعی اور قومی شر و فساد ہے۔ یعنی اعتقاد و عمل کی خرابیاں اگر متفرق طور پر افراد میں پائی جاتی ہوں، لیکن مجموعی طور پر قوم کا دینی و اخلاقی معیار اتنا بلند ہو کہ افراد کی برائیاں اس کے اثر سے دبی رہیں، تو خواہ افراد علٰحدہ علٰحدہ کتنے ہی خراب ہوں، قوم بحیثیت مجموعی پھلی پھولی رہتی ہے اور کوئی فتنۂ عام برپا نہیں ہوتا جو پوری قوم کی بربادی کا موجب ہو۔ مگر جب اعتقاد و عمل کی خرابیاں افراد سے گذر کر پوری قوم میں پھیل جاتی ہیں اور قوم کا دینی احساس اور اخلاقی شعور اس درجہ ماؤف ہو جاتا ہے کہ اس میں خیر و صلاح کے بجائے شر و فساد کو پھلنے اور پھولنے کا موقع ملنے لگے، تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت ایسی قوم سے پھر جاتی ہے اور وہ عزت کے مقام سے ذلت کی طرف گرنے لگتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اللہ کا غضب اس پر بھڑک اٹھتا ہے اور اس کو بالکل تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں اس کی بکثرت مثالیں بیان کی گئی ہیں ۔

قوم نوح کو اس وقت برباد کیا گیا جب اعتقاد و عمل کی خرابیاں ان کے اندر جڑ پکڑ گئیں اور زمین میں پھیلنے لگیں، اور یہ امید ہی باقی نہ رہی کہ اس شجر خبیث سے کبھی کوئی اچھا پھل بھی پیدا ہوگا۔ تب حضرت نوح نے بارگاہ رب العزۃ میں عرض کیا کہ:۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا	پروردگار، ان کافروں میں سے ایک کو بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑ۔ اگر تو نے ان کو
اِنَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْٓا	چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے
اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا ۔ (۷۱: ۲)	جو پیدا ہوگا بدکار اور سخت کافر ہی پیدا ہوگا ۔

قوم عاد کو اس وقت تباہ کیا گیا جب شر اور فساد نے ان کے دلوں میں یہاں تک گھر کر لیا کہ شریر اور مفسد اور ظالم ان کی قوم کے لیڈر اور حاکم بن گئے، اور اہل خیر و صلاح کے لیے نظام اجتماعی میں کوئی گنجائش باقی نہ رہی:۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا	اور وہ عاد ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام سے انکار کیا
رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۱:۵)	اور اسکے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر جبار دشمن حق کا اتباع کیا

قوم لوط کو اس وقت ہلاک کیا گیا جب ان کا اخلاقی شعور اتنا باطل ہو گیا، اور ان میں بے حیائی یہاں تک بڑھ گئی کہ علانیہ مجلسوں اور بازاروں میں فواحش کا ارتکاب کیا جانے لگا، اور فواحش کے فواحش ہونے کا احساس ہی باقی نہ رہا

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ	(لوط نے کہا) کہ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو اور
وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (۲۹:۲۹)	راستوں میں لوگوں کو چھیڑتے اور ستاتے ہو اور اپنی محفلوں میں بدکاریاں کرتے ہو۔

اہل مدین پر اس وقت عذاب نازل ہوا جب پوری قوم خائن اور بدمعاملہ اور بے ایمان ہو گئی کم تولنا اور زیادہ لینا کوئی عیب نہ رہا، اور قوم کا اخلاقی احساس یہاں تک فنا ہو گیا کہ جب ان کو اس عیب پر ملامت کیجاتی تو شرم سے سر جھکا لینے کے بجائے وہ الٹا اس ملامت کرنے والے کو ملامت کرتے، اور ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان میں کوئی ایسا عیب بھی ہے جو ملامت کے قابل ہو۔ وہ اپنی بدکاریوں کو برا نہ سمجھتے بلکہ جو انہیں برا کہتا اسی کو برسر غلط اور لائق سرزنش خیال کرتے:۔

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ	(شعیب علیہ السلام نے کہا) اور اے میری قوم کے لوگو! انصاف کیساتھ ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین
وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا	
فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ..... قَالُوْا يٰشُعَيْبُ	میں فساد نہ پھیلاؤ ..... انھوں نے جواب دیا کہ اے شعیب!
مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ	جو باتیں تو کہتا ہے ان میں سے تو اکثر ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔
فِيْنَا ضَعِيْفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (۱۱:۸)	اور ہم تو تجھے اپنی قوم میں کمزور پاتے ہیں اور اگر تیرا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے

بنی اسرائیل کو ذلت و مسکنت اور غضب و لعنت آلہی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ اس وقت صادر ہوا جب انہوں نے بدی اور ظلم اور حرام خواری کی طرف لپکنا شروع کیا، ان کی قوم کے پیشوا مصلحت پرستی کے مرض میں مبتلا ہو گئے، ان میں گناہوں کے ساتھ رواداری پیدا ہو گئی، اور ان میں کوئی گروہ ایسا نہ رہا جو عیب کو عیب کہنے والا اور اس سے روکنے والا ہوتا۔

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۵: ۹)

تو ان میں سے اکثر کو دیکھتا ہے کہ گناہ اور حد سے تجاوز اور حرام خوری کی طرف لپکتے ہیں یہ کیسی بری حرکتیں ہیں جو وہ کرتے تھے کیوں نہ ان کے مشائخ اور علماء نے ان کو بری باتیں کہنے اور حرام کے مال کھانے سے منع کیا؟ یہ بہت برا وطیرہ تھا جو وہ کرتے تھے

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ (۵: ۱۱)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کرائی گئی اس لیے کہ انہوں نے سرکشی کی اور وہ حد سے گذر جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو برے افعال سے نہ روکتے تھے۔

اس آخری آیت کی تفسیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث منقول ہیں وہ قرآن حکیم کے مقصد کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ سب روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور نے فرمایا۔

> بنی اسرائیل میں جب بدکاری پھیلنی شروع ہوئی تو حال یہ تھا کہ ایک شخص اپنے بھائی یا دوست یا ہمسایہ کو برا کام کرتے دیکھتا تو اس کو منع کرتا اور کہتا کہ اے شخص خدا کا خوف کر۔ مگر اس کے بعد وہ اسی شخص کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتا اور یہ بدی کا مشاہدہ اس کو اس بدکار شخص کے ساتھ میل جول اور کھانے پینے میں شرکت سے نہ روکتا۔ جب ان کا یہ حال ہو گیا تو ان کے دلوں

ایک دوسرے کا اثر پڑ گیا اور اللہ نے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا اور ان کے نبی داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی"۔

راوی کہتا ہے کہ جب حضور سلسلۂ تقریر میں اس مقام پر پہنچے تو جوش میں آکر اٹھ بیٹھے اور فرمایا:۔

"قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور بدی سے روکو اور جس کو بُرا فعل کرتے دیکھو اس کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے راہ راست کی طرف موڑ دو اور اس معاملہ میں ہرگز رواداری نہ برتو، ورنہ اللہ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دیگا، اور تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح بنی اسرائیل پر کی"۔

اعتقاد اور عمل کے فساد کا حال وبائی امراض کا سا ہے۔ ایک وبائی مرض ابتدا میں چند کمزور افراد پر حملہ کرتا ہے اگر آب وہوا اچھی ہو، حفظان صحت کی تدابیر درست ہوں، نجاستوں اور کثافتوں کو دور کرنے کا کافی انتظام ہو، اور مرض سے متاثر ہونے والے مریضوں کا بر وقت علاج کر دیا جائے، تو مرض وبائے عام کی صورت اختیار کرنے نہیں پاتا اور عام لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں لیکن اگر طبیب غافل ہوں حفظان صحت کا محکمہ بے پروا ہو صفائی کے منتظم نجاستوں اور کثافتوں کے روادار ہو جائیں، تو رفتہ رفتہ مرض کے جراثیم فضا میں پھیلنے لگتے ہیں، اور آب وہوا میں سرایت کرکے اس کو اتنا خراب کر دیتے ہیں کہ وہ صحت کے بجائے مرض کے لیے سازگار ہو جاتی ہے۔ آخر کار جب بستی کے عام افراد کو ہوا، پانی، غذا، لباس، مکان غرض کوئی چیز گندگی اور سمیت سے پاک نہیں ملتی تو ان کی قوت حیات جواب دینے لگتی ہے، اور ساری کی ساری آبادی وبائے عام میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر قوی سے قوی افراد کے لیے بھی اپنے آپ کو مرض سے بچانا مشکل ہو جاتا ہے، خود طبیب اور صفائی کے منتظم اور صحت عامہ کے محافظ بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور وہ لوگ بھی ہلاکت سے محفوظ نہیں رہتے جو اپنی حد تک حفظان صحت کی جملہ تدبیریں اختیار کرتے ہیں اور دوائیں استعمال کرتے رہتے ہیں کیونکہ ہوا کی سمیت، پانی کی

گندگی، وسائل غذا کی خرابی، اور زمین کی کثافت کا ان کے پاس کیا علاج ہو سکتا ہے۔

اسی پر اخلاق و اعمال کے فساد اور اعتقاد کی گمراہیوں کو بھی قیاس کر لیجیے۔ علما، قوم کے طبیب ہیں، حکام اور اہل دولت، صفائی اور حفظان صحت کے ذمہ دار ہیں۔ قوم کی غیرت ایمانی اور حاسۂ اخلاقی بمنزلۂ قوت حیات (Vitality) ہے، اجتماعی ماحول کی حیثیت وہی ہے جو ہوا، پانی، غذا اور لباس و مکان کی ہے، اور حیات قومی میں دین و اخلاق کے اعتبار سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا وہی مقام ہے جو صحت جسمانی کے اعتبار سے صفائی و حفظان صحت کی تدابیر کا ہے۔ جب علما اور اولی الامر اپنے اصلی فرض یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ دیتے ہیں، اور شر و فساد کے ساتھ رواداری برتنے لگتے ہیں تو گمراہی اور بداخلاقی قوم کے افراد میں پھیلنی شروع ہو جاتی ہے اور قوم کی غیرت ایمانی ضعیف ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ سارا اجتماعی ماحول فاسد ہو جاتا ہے۔ قومی زندگی کی فضا، خیر و صلاح کے لیے ناساعد اور شر و فساد کے لیے سازگار ہو جاتی ہے لوگ نیکی سے بھاگنے لگتے ہیں، اور بدی سے نفرت کرنے کے بجائے اس کی طرف کھنچنے لگتے ہیں، اخلاقی قدریں الٹ جاتی ہیں، عیب ہنر بن جاتے ہیں، اور ہنر عیب۔ اس وقت گمراہیاں اور بداخلاقیاں خوب پھلتی پھولتی ہیں۔ اور بھلائی کا کوئی بیج برگ و بار لانے کے قابل نہیں رہتا، زمین، ہوا اور پانی سب اس کی پرورش کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، کیونکہ ان کی ساری قوتیں اشجار خبیثہ کو نشو و نما دینے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ جب کسی قوم کا یہ حال ہو جاتا ہے، تو پھر وہ عذاب الٰہی کی مستحق ہو جاتی ہے، اور اس پر ایسی عام تباہی نازل ہوتی ہے جس سے کوئی نہیں بچتا، خواہ وہ خانقاہوں میں بیٹھا عبادت گذاری ہی کیوں نہ کر رہا ہو۔

اس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ:-

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (۸:۲۵) بچو اس فتنہ سے جو صرف انہی لوگوں کو مبتلائے مصیبت نہ کرے گا جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیۃ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا منشا اس سے یہ ہے کہ بدی کو اپنے سامنے نہ ٹھیرنے دو، کیونکہ اگر تم بدی سے رواداری کروگے اور اس کو پھیلنے دوگے تو اللہ کی طرف سے عذاب عام نازل ہوگا اور اس کی لپیٹ میں اچھے اور برے سب آجائیں گے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ:-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُعَذِّبُ الْعَامَّۃَ بِعَمَلِ الْخَاصَّۃِ	اللہ خاص لوگوں کے عمل پر عام لوگوں کو عذاب نہیں
حَتّٰی یَرَوُا الْمُنْکَرَ بَیْنَ ظَهْرَانَیْهِمْ وَهُمْ	دیتا۔ مگر جب وہ اپنے سامنے بدی کو دیکھیں اور اس کو روکنے
قَادِرُوْنَ عَلٰی اَنْ یُّنْکِرُوْهُ فَلَا یُنْکِرُوْهُ	پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کو نہ روکیں تو اللہ
فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ عَذَّبَ اللّٰہُ الْخَاصَّۃَ وَالْعَامَّۃَ	خاص اور عام سب کو مبتلائے عذاب کر دیتا ہے۔

قوم کی اخلاقی اور دینی صحت کو برقرار رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ اس کے ہر فرد میں غیرت ایمانی اور حاسۂ اخلاقی موجود ہو، جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع لفظ "حیاء" سے تعبیر فرمایا ہے یہ حیاء دراصل ایمان کا ایک جزء ہے جیسا کہ حضور نے فرمایا ہے اِنَّ الْحَیَاءَ مِنَ الْاِیْمَانِ۔ بلکہ ایک موقع پر جب حضور سے عرض کیا گیا کہ حیاء، دین کا ایک جزء ہے، تو آپ نے فرمایا بَلْ هُوَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ" یعنی وہ پورا دین ہے۔

حیاء سے مراد یہ ہے کہ بدی اور معصیت سے نفس میں طبیعی طور پر انقباض پیدا ہو، اور دل اس سے نفرت کرے جس شخص میں یہ صفت موجود ہوگی وہ نہ صرف قبائح سے اجتناب کرے گا بلکہ دوسروں میں بھی اس کو برداشت نہ کر سکے گا۔ وہ برائیوں کے دیکھنے کا روادار نہ ہوگا ظلم اور معصیت سے مصالحت کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ جب اس کے سامنے قبائح کا ارتکاب کیا جائے گا تو اس کی غیرت ایمانی جوش میں آجائیگی اور وہ اس کو ہاتھ سے یا زبان سے مٹانے کی کوشش کرے گا، یا کم از کم اس کا دل اس خواہش سے بے چین

ہو جائیگا کہ اس برائی کو مٹا دے۔

مَن رأیٰ منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانه فان لم یستطع فبقلبه وذٰلك اضعف الایمان	تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ سے مٹا دے اور اگر ایسا نہ کرسکتا ہو تو زبان سے اور اگر یہ بھی نہ کرسکتا ہو تو دل سے اور یہ ضعیف ترین ایمان ہے۔

جس قوم کے افراد میں عام طور پر یہ صفت موجود ہوگی اس کا دین محفوظ رہے گا اور اس کا اخلاقی معیار کبھی نہ گر سکے گا، کیونکہ اس کا ہر فرد دوسرے کے لیے محتسب اور نگران ہوگا اور عقیدہ و عمل کے فساد کو اس میں داخل ہونے کے لیے کوئی راہ نہ مل سکے گی۔

قرآن مجید کا مقصد دراصل ایسی ہی ایک آئیڈیل سوسائٹی بنانا ہے، جس کا ہر فرد اپنے قلبی رجحان اور اپنی فطری غیرت وحیا، اور خالص اپنے ضمیر کی تحریک پر احتساب اور نگرانی کا فرض انجام دے اور کسی اُجرت کے بغیر خدائی فوجدار بنا پھرے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲ : ۱۷)	اور اس طرح ہم نے تم کو ایک عادل و معتدل امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر نگران رہو اور رسول تم پر نگران رہے۔

اسی لیے بار بار مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا تمہارا قومی خاصہ ہے جو ہر مومن مرد اور عورت میں متحقق ہونا چاہیے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۳ : ۱۲)	تم بہترین قوم ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے تم نیکی کا حکم کرتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹ : ۹)	مومن مرد اور عورت ایک دوسرے کے مددگار ہیں نیکی کا حکم کرتے اور بدی سے روکتے ہیں۔
اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (۹ : ۱۴)	وہ نیکی کا حکم کرنے والے اور بدی سے روکنے والے اور حدود الٰہی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔
اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲ : ۶)	یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ہم اگر زمین میں حکومت بخشیں گے تو یہ نماز قائم کریں گے زکواۃ دیں گے نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اگر مسلمانوں کا یہ حال ہو تو ان کی مثال اس بستی کی سی ہوگی جس کے ہر باشندے میں صفائی اور حفظان صحت کا احساس ہو۔ وہ نہ صرف اپنے جسم اور اپنے گھر کو صاف پاک رکھے، بلکہ بستی میں جہاں کہیں غلاظت اور نجاست دیکھے اس کو دور کردے، اور کسی جگہ گندگی و کثافت کے رہنے کا روادار نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی بستی کی آب و ہوا پاک صاف رہے گی۔ اس میں امراض کے جراثیم پرورش نہ پاسکیں گے اور اگر شاذو نادر کوئی شخص کمزور اور مریض الطبع ہوگا بھی تو اس کا ہر وقت علاج ہو جائے گا، یا کم از کم اس کی بیماری محض شخصی بیماری ہوگی، دوسروں تک متعدی ہو کر وبائے عام کی صورت نہ اختیار کر سکے گی۔

لیکن اگر مسلمانوں کی قوم اس بلند درجہ پر نہ رہ سکے، تو قوم کی دینی و اخلاقی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے کم از کم ایک ایسا گروہ تو ان میں ضرور موجود رہنا چاہیے جو ہر وقت اپنی خدمت پر مستعد رہے اور اعتقاد کی گندگیوں اور اخلاق و اعمال کی نجاستوں کو دور کرتا رہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ	تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف

وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (۳ : ۱۱) بلانے والی ہو نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔

یہ جماعت علماء اور اولی الامر کی جماعت ہے جس کا امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں منہمک رہنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا شہر کے محکمۂ صفائی وحفظان صحت کا اپنے فرائض میں مستعد رہنا ضروری ہے اگر یہ لوگ اپنے فرض سے غافل ہو جائیں اور قوم میں ایک جماعت بھی ایسی باقی نہ رہے جو خیر و صلاح کی طرف دعوت دینے والی اور منکرات سے روکنے والی ہو، تو دین و اخلاق کے اعتبار سے قوم کی تباہی اسی طرح یقینی ہے جس طرح جسم و جان کے اعتبار سے اس بستی کی ہلاکت یقینی ہے جس میں صفائی وحفظان صحت کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اگلی قوموں پر جو تباہیاں نازل ہوئی ہیں وہ اسی لیے ہوئی ہیں کہ ان میں کوئی گروہ بھی ایسا باقی نہ رہا تھا جو ان کو برائیوں سے روکتا اور خیر و صلاح پر قائم رکھنے کی کوشش کرتا۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنجَيْنَا مِنْهُمْ (۱۱ : ۱۰) تم سے پہلے کی قوموں میں کم از کم ایسے اہل فضل ہی کیوں نہ ہوئے جو زمین میں فساد سے روکنے والے ہوتے بجز چند آدمیوں کے جن کو ہم نے ان میں سے بچا کر نکال لیا

لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ (۵ : ۹) کیوں نہ ان کے علما اور مشائخ نے ان کو بری باتیں کہنے اور حرام خوری کرنے سے باز رکھا۔

پس قوم کے علما و مشائخ اور اولی الامر کی ذمہ داری سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ وہ صرف اپنے ہی اعمال کے جواب دہ نہیں ہیں بلکہ پوری قوم کے اعمال کی جواب دہی بھی ایک بڑی حد تک ان پر عائد ہوتی ہے۔ ظالم جفاکار اور عیش پسند امراء، اور ایسے امراء کی خوشامدیں کرنے والے علماء و مشائخ کا تو خیر کہنا ہی کیا ہے، ان کا جو کچھ حشر خدا کے ہاں ہو گا اس کے ذکر کی حاجت نہیں لیکن جو امراء اور علماء و مشائخ اپنے محلوں اور اپنے گھروں اور اپنی خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کی داد دے رہے ہیں

وہ بھی خدا کے ہاں جوابدہی سے نہیں بچ سکتے۔ کیوں کہ جب ان کی قوم پر ہر طرف سے گمراہی اور بداخلاقی کے طوفان امڈے چلے آرہے ہوں، تو ان کا کام یہ نہیں ہے کہ گوشوں میں سر جھکائے بیٹھے رہیں، بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ مرد میدان بن کر نکلیں اور جو کچھ زور اور اثر اللہ نے ان کو عطا کیا ہے اس کو کام میں لا کر اس طوفان کا مقابلہ کریں۔ طوفان کو دور کر دینے کی ذمہ داری بلاشبہ ان پر نہیں، مگر اس کے مقابلہ میں اپنی پوری امکانی قوت صرف کر دینے کی ذمہ داری تو یقیناً ان پر ہے۔ اگر وہ اس میں دریغ کریں گے تو ان کی عبادت و ریاضت اور شخصی پرہیزگاری ان کو یوم الفصل کی جوابدہی سے بری نہ کر دیگی۔ آپ محکمۂ صفائی کے اس افسر کو کبھی بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے جس کا حال یہ ہو کہ شہر میں تو وبا پھیل رہی ہے اور ہزاروں آدمی ہلاک ہو رہے ہوں، مگر وہ اپنے گھر میں بیٹھا خود اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے کی تدبیر کر رہا ہو۔ عام شہری اگر ایسا کریں تو چنداں قابل اعتراض نہیں لیکن محکمۂ صفائی کا افسر ایسا کرے تو اس کے مجرم ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔

مقالات

کتب سماوی پر ایک نظر

(۱۳)
توریت و انجیل پر اسلامی رائے

از جناب ذوقی شاہ صاحب

فطرت انسانی کی ایک کمزوری جہاں فطرت انسانی میں اور کمزوریاں واقع ہوئی ہیں وہاں ایک قابل افسوس کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ ہر چیز کے غلبۂ ظاہری سے بلا امتیاز حق و باطل مرعوب و مغلوب ہو جاتی ہے مسلمانوں کو اس کمزوری پر غالب ہونا چاہیے۔ باطل کے ظاہری اور عارضی غلبہ سے کسی مسلمان کا مرعوب ہو جانا ضعف ایمانی کی دلیل ہے مثلاً آج کل دہریت اور الحاد کا زور ہے اور ناتمام ناقص اور غیر مکمل سائنس کی عام طور پر لوگوں کے دل و دماغ پر حکومت ہے۔ اس دہریت اور سائنس سے متاثر ہو کر بعض ضعیف الایمان مسلمانوں نے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ وہ قرآن اور حدیث کی ہر بات کو تاویل باطل کے ذریعہ سے موجودہ سائنس کے مطابق ظاہر کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اب سے تقریباً پچاس سال قبل ہندوستان میں پادری مبلغین کی مسیحیت کا زور و شور ہوا تھا اور اس زمانے کے بعض جدت پسند اور ہر نئی چیز سے جلد متاثر ہو جانے والے اور حکمران قوم کی ہر ادا پر فریفتہ ہونے والے اور مٹ جانے والے مسلمانوں نے توریت و انجیل کا مطالعہ اور ان پر تفسیریں لکھنا اور کتابیں شائع کرنا شروع کر دیا تھا انہیں

سے بعض لوگ تو علانیہ عیسائی بن کر اور پادریوں کے زمرہ میں داخل ہو کر تبلیغ عیسویت میں ان کے مددومعاون بن گئے تھے۔ اور ان میں سے بعض مسلمانوں کو یہ خبط پیدا ہو گیا تھا کہ انھوں نے مسلمانوں میں اس نوع کے خیالات کی اشاعت شروع کر دی تھی کہ مسلمانوں کے لیے موجودہ توریت و انجیل بلاواسطۂ قرآن واجب العمل ہیں! اور ان کتب میں اور قرآن مجید میں بلحاظ عمل و تمسک کوئی فرق نہیں ہے۔

ان کا مقولہ تھا کہ :۔

"مسلمان ان کتابوں کو ویسا ہی پڑھیں جیسا کہ قرآن مجید کو پڑھتے ہیں اور ان واقعات وحوادث میں جو ان کو روزمرہ پیش آتے ہیں! ان کتابوں سے فتوٰی لیں اور اخذِ احکام کریں جیسے کہ قرآن سے اخذ احکام کرتے ہیں۔ خصوصاً ان مسائل میں جو قرآن میں نہیں ہیں اور ان کتابوں میں موجود ہیں۔"

ان میں سے بعض حضرات قرآن پر یہ مہربانی کرتے تھے کہ ان کتابوں کے رتبہ کو قرآن کے رتبہ سے کمتر مگر حدیث کے رتبہ سے بڑھکر یا اس کے برابر خیال کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ:۔

"جو حکم قرآن سے نہ ملے وہ اِن کتابوں سے اخذ کیا جائے اور ان کتابوں میں نہ ملے تب کتب حدیث سے لیا جائے۔ اور کم سے کم یہ ہو کہ ان کتب کو کتب حدیث کے برابر سمجھا جائے۔"

اگرچہ دہریت کے سیلاب نے اب اُس عیسویت کو بھی بہادیا اور اس عیسویت پسندی کا بھی نام و نشان باقی نہ رکھا تاہم ضرورت ہے کہ عام مسلمانوں کے فائدہ کی غرض سے عمل بالتوراۃ والانجیل پر مستند عامسلک یہاں بالصراحت بیان کر دیا جائے۔

عمل بالتوراۃ والانجیل زمانہ نبوت سے لیکر اس وقت تک موجودہ توریت و انجیل وغیرہ کی نسبت اہل اسلام کا یہ اعتقاد متواتر و متوارث چلا آرہا ہے کہ ان کتابوں کے جو احکام منجانب اللہ ہیں اور منسوخ نہیں ہوئے یا سابق امتوں کے ساتھ مخصوص نہیں، وہ امتِ محمدیہ کے لیے واجب العمل ہیں۔ مگر ان احکام پر مسلمانوں کا

عمل قرآن پر عمل کے ضمن میں پایا جاتا ہے کیونکہ قرآن مجید تمام کتب سابقہ کے واجب العمل احکام کا جامع ہے اور جملہ کتب منزل من اللہ اصلاً اس میں شامل ہیں۔ حقیقتاً قرآن کی تعمیل کتب ما قبل کے احکام واجب التعمیل کی بھی تعمیل ہے۔ حدیث صحیح بھی قرآن کے حکم کے تحت میں ہے گو اس میں قطعیت وظنیت کا فرق ہے اس لیے جو حکم احادیث صحیح میں وارد ہے اُس کو بھی مسلمان حکم قرآنی سمجھتے ہیں اور قرآن کی طرح واجب العمل جانتے ہیں اس بنا پر شرائع سابقہ کے جو احکام احادیث میں منقول ہیں ان کی تعمیل بھی گویا قرآن ہی کی تعمیل ہے۔

مگر یہ اعتقاد متقدمین ومتاخرین میں سے کسی محقق سے منقول نہیں کہ موجودہ توریت وانجیل سے اخذ احکام بلاواسطۂ قرآن واجب ہے اور قرآن کی طرح ان کتابوں سے تمسک کرنا مسلمانوں کا فرض ہے نہ یہ عمل ان سے مروی ہے کہ ان کتابوں پر بلاواسطۂ قرآن انہوں نے اعتماد کیا ہو اور واقعات روز مرہ میں ان کتابوں سے فتویٰ لیا ہو۔

احکام کتب سابقہ تین اقسام پر تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) وہ احکام جو قرآن وحدیث کے مطابق ہیں۔ ان کی تعمیل قرآن کی تعمیل ہے۔

(۲) وہ احکام جو قرآن وحدیث کے خلاف ہیں ان کی تعمیل کا نہ کرنا ہی مسلمانوں پر لازم ہے اس قسم کے احکام یا تو وہ ہیں جو درحقیقت کتب قدیمہ میں تھے مگر اب شریعت محمدی نے انہیں منسوخ کر دیا یا وہ ہیں جو اہل کتاب کی طرف سے اُن کتابوں میں بڑھا گھٹا دیے گئے ہیں اور تحریف والحاق کے تحت میں آتے ہیں۔

(۳) وہ احکام یا وہ امور جن کی بابت قرآن وحدیث میں نہ کوئی تائید وموافقت پائی جاتی ہے نہ تردید ومخالفت۔ ان کی بابت مسلمانوں کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حکم ہے کہ "مسلمانو! تم اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب کرو اور یہ کہو کہ ہم اس چیز پر ایمان لائے

جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوی ہے۔ یعنی جن امور پر قرآن و حدیث ساکت ہیں ان پر یہ شرطی اور اجمالی اعتقاد مسلمانوں کے لیے کافی ہے کہ اگر وہ بات منجانب اللہ ہے تو ہم نے اسے مانا اور تسلیم کیا

قسم اول یعنی احکام واجب التعمیل کے متعلق علماء نے بہت کچھ بحث کی ہے۔

صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل منقول ہے کہ آپنے داؤد علیہ السلام کی موافقت میں سجدہ کیا۔

سنن نسائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول منقول ہے کہ حضرت داؤد نے توبۃً سجدہ کیا تھا۔ اور ہم اس کے شکریہ میں سجدہ کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ اُن سے کسی نے پوچھا کہ آیا سورہ صٓ میں سجدہ ہے؟ آپنے فرمایا بے شک اس میں سجدہ ہے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سجدہ کرتے دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے نبیوں کے فعل کی پیروی پر مامور تھے۔

ان ہی افعال و اقوال سے علماء نے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ جو فعل یا حکم انبیائے سابقین سے قرآن میں منقول ہو اور کوئی حکم اس کا مخالف یعنی ناسخ ہماری شریعت میں وارد نہ ہو وہ حکم اہل اسلام کے لیے لائق دستاویز ہے۔

تفسیر کبیر میں امام رازی نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے تحت میں کہ "جن لوگوں کی ہم نے ہدایت کی ہے ان کی پیروی کرو" تحریر فرمایا ہے کہ:-

"ہدایت یافتہ لوگوں سے انبیاء مراد ہیں اور ان کی پیروی کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوا ہے۔ جن امور میں پیروی کا یہ حکم وارد ہوا ہے ان کی تعیین میں علماء کے درمیان اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ ان سے وہ امور مراد ہیں جن میں سب انبیاء کا اتفاق ہے مثلاً توحید الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات وافعال کی

نامناسب اعتقاد سے پاک رکھنا وغیرہ۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ان امور سے اخلاقِ حمیدہ اور صفات رفیعہ وکاملہ میں پیروی مراد ہے جیسے کہ سفہاء کی ایذا پر صبر اور ان کے ساتھ عفو۔ بعض کا یہ قول ہے کہ اس سے ان کے جملہ احکام شریعت مراد ہیں بجز اُن احکام کے جن کو مستثنیٰ و مخصوص کر دیا گیا ہو۔ اس قول کی رو سے بھی شریعتیں ہمارے لیے واجب العمل ٹھیرتی ہیں۔"

مگر امام قرطبی اور دیگر علماء نے مندرجۂ بالا تیسرے قول کی تفصیل میں اس نہایت ضروری شرط پر زور دیا ہے کہ شریعت سابقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے معلوم ہوئی ہو اور وہ امت سابقہ کے ساتھ مخصوص یا بعد میں منسوخ نہ ہوئی ہو۔ کتب سابقہ میں تحریف و تبدیل کے وقوع یقینی نے اس شرط کو بہت ضروری بنا دیا ہے۔

بعض علماء کا یہ قول ہے کہ ہمارے لیے ان شریعتوں کی پیروی واجب نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا (ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک شریعت بنا دی ہے) اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی شریعتیں خاص خاص اوقات و مقامات کے لیے مخصوص رہی ہیں اور ان اقوال خداوندی میں جن سے پیروی کا لزوم ثابت کیا جاتا ہے مثلاً فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ اور مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اصول اعتقادی مراد ہیں نہ فروع عملی۔

بعض علماء کا یہ قول ہے کہ وہ شریعتیں ہمارے لیے واجب العمل ہیں مگر نہ اس اعتقاد سے کہ وہ پہلوں کی شریعتیں ہیں بلکہ اس اعتقاد سے کہ وہ اب ہمارے لیے شریعت بن گئی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا یعنی پھر ہم نے کتاب کا وارث اُن لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے چن لیا (یعنی مسلمان بنا لیا) اور ظاہر ہے کہ جو چیز کسی کی ملکیت میں آتی ہے وہ اسی کی ملک ہو جاتی ہے۔ مورث سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ لہٰذا ہم ان شریعتوں پر اس اعتقاد سے عمل کریں گے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی شریعت ہے۔ اس کی مثال

تائید میں وہ اس قول نبوی کو بھی پیش کرتے ہیں کہ "اگر اس وقت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو وہ بھی میری ہی پیروی کرتے" علماء کا یہ گروہ پہلی شریعتوں کو جو اپنی شریعت قرار دیتا ہے تو وہ صرف اصول دینی ہی کو نہیں لیتا بلکہ پوری شریعتوں کو لیتا ہے جن میں فروع بھی شامل ہیں۔ ان میں سے جو احکام منسوخ ہو چکے ہیں اُن کی بابت یہ گروہ کہتا ہے کہ اس سے شریعت بدل نہیں گئی بلکہ ان احکام کی تعمیل کی مدت معینہ ختم ہو چکی۔

اس نوع کے اختلافات محض لفظی ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ صرف انداز بیان میں فرق ہے پرانی شریعتوں کو خواہ اپنا قرار دیا جائے یا انبیاء قدیم کا، مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل وہ اُسی صورت میں ہو سکتی ہیں جبکہ وہ قرآن و حدیث کی وساطت سے پہنچیں یا قرآن و حدیث کے مطابق ہوں۔ موجودہ توریت و انجیل سے براہ راست تمسک کا نہ سلف میں کوئی قائل ہے نہ خلف میں امام رازی کے قول کو بھی مزید اطمینان کے لیے ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے اپنی کتاب المحصل میں اپنے اس دعوے کی تائید میں بیان کیا ہے کہ :- "پچھلی کتابوں کا اتباع ہم پر واجب نہیں"۔

"دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان شریعتوں کی (یعنی جو ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں) پیروی کرتے تو ہر زمانے کے علماء پر یہ امر واجب قرار پاتا کہ وہ اپنے واقعات و حوادث پیش آمدہ میں ان کتابوں کی طرف مراجعت کریں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل کی پیروی اُن پر واجب ہے اور جب انہوں نے یقیناً ایسا نہیں کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی وقوع میں نہیں آیا۔ اس سے ان کتابوں کا واجب العمل ہونا باطل ہوا۔

تیسری دلیل۔ اگر وہ کتابیں ہمارے لیے لائق دستاویز ہوتیں تو ان کتابوں کو یاد کرنا

ہمارے لیے فرض کفایہ ہوتا جیسا کہ قرآن و حدیث کا یاد کرنا فرض کفایہ ہے اور علماء باہمی اختلاف کے مواقع پر ان کتابوں کی طرف رجوع کرتے جبکہ ان کو بعض مسائل میں اشتباہ ہوا تھا۔ مثلاً فرائض کا مسئلہ عول اور جدّہ و زن مفوضہ (یعنی وہ عورت جس کا مہر بوقت نکاح مقرر نہ ہوا اور اس کے شوہر نے قبل ہم بستری وفات پائی) کی میراث اور ام ولد کی بیع اور شراب و زنا کی حد اور مخنث کی دیت اور زرخرید کنیز عیب دار کا ہم بستری کے بعد واپس کرنا اور مباشرت بلا انزال سے غسل کا واجب ہونا وغیر ذالک۔ اور یہ امر کسی ایک سے بھی منقول نہیں کہ انہوں نے اپنی تمام عمر میں باوجود کثرت واقعات اور باہمی اختلافات کے توریت کی طرف رجوع کیا ہو خاص کر اس حالت میں جب کہ یہودیوں کے علماء مسلمان ہو گئے تھے جیسے عبداللہ بن سلام اور کعب احبار اور وہب بن منبہ (جن کے اقوال توریت کے متعلق مستند سمجھے جاتے تھے) ان کے ذریعہ سے یہ رجوع آسان تھا۔ مگر ایسا نہ کیا اور مسائل میں انہوں نے اپنے ہی قیاس کی طرف رجوع کیا۔ یہ بات کتاب اللہ سے مایوسی کے بعد جائز ہوتی ہے، اور مایوسی کتاب اللہ کو سیکھنے سے پہلے ہو نہیں سکتی جب انہوں نے نہ ان کتابوں کو سیکھا نہ ان کے احکام دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ان کتابوں کو قابل تمسک نہ سمجھا۔

چوتھی دلیل آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ کے اس قول کو کہ "میں کتاب اللہ اور سنت میں کوئی حکم نہ پاؤں گا تو اپنے اجتہاد سے فتویٰ دونگا" پسند کیا اگر ان کو توریت کی پیروی کا حکم ہوتا تو ان کا اپنے اجتہاد پر عمل کرنا جائز نہ ہوتا تاوقتیکہ توریت اور انجیل کو وہ دیکھ نہ لیتے۔ اس دلیل پر اگر یہ اعتراض ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے معاذ کو اسی صورت میں اجتہاد کی اجازت دی جبکہ کتاب اللہ میں انہیں کوئی حکم نہ ملے اور توریت بھی تو کتاب اللہ ہے۔ یا یہ اعتراض ہو کہ توریت کا صاف نام انہوں نے اس لیے نہیں لیا کہ توریت کی طرف رجوع کرنے کا حکم قرآن میں آچکا ہے۔ لہذا قرآن کی طرف رجوع کرنا خود توریت کی طرف رجوع دلاتا ہے۔ تو پہلے اعتراض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ (مسلمانوں میں) جب لفظ کتاب اللہ بے قید بولا جاتا ہے تو اس سے قرآن مراد ہوتا ہے۔ لہذا اس سے توریت وانجیل بلادلیل مراد نہیں ہو سکتیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبل سے کہیں ثابت نہیں ہوا کہ انہوں نے توریت وانجیل کو سیکھا یا ان کے محرف وغیر محرف احکام میں تمیز کی ہو۔ جیسا کہ قرآن کا پڑھنا اور سیکھنا ان سے بخوبی ثابت ہے۔ دوسرے اعتراض کا جواب بھی ادا ہو گیا کہ موجودہ توریت وانجیل کی طرف ہر بات میں رجوع کرنے کا قرآن میں حکم ہوتا تو حضرت معاذ ان کتابوں کو پڑھتے اور سیکھتے اور ان کی طرف کبھی تو رجوع کرتے۔"

اس بارہ میں جن لوگوں نے غلطی کھائی ہے انہوں نے غالباً ان آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے سمجھنے میں غلطی کی ہے جن میں بطور اجمال ان کتابوں کو نور و ہدایت کہا گیا ہے اور بعض مواقع خاص میں ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ ان آیات واحادیث میں توریت وانجیل کی ہر بات کو ہدایت و نور نہیں کہا گیا۔ اور نہ ہر موقع و محل میں ان کتابوں کی طرف رجوع کرنے کا خدا اور رسول نے حکم دیا ہے۔ بلکہ ان کو بالاجمال ہدایت کہنے سے انہیں باتوں کا ہدایت ہونا مقصود ہے جن کا منجانب اللہ محفوظ و واجب العمل ہونا شہادت قرآن وحدیث ثابت ہے اور انہیں مواقع خاص میں ان کتابوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن میں اہل کتاب کے تصرف و دخل نہیں ہونے پایا۔ کوئی مسلمان اس بات کو نہیں مان سکتا کہ موجودہ توریت وانجیل میں جو کچھ لکھا

سب سچ ہے۔ مثلاً کوئی مسلمان اس بات کے ماننے کے لئے تیار نہیں کہ لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کے ساتھ اور داؤد علیہ السلام نے اوریا کی جورو کے ساتھ (نعوذ باللہ) زنا کیا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام معاذ اللہ) خدا کے بیٹے یا خود خدا یا تین خداؤں کی کمیٹی کے ممبر تھے اور باوجود اس کے گنہگاروں کے بدلے معذب ہوئے۔ اللہ و رسول اس سے بری ہیں کہ مسلمانوں کو ان لغو اور بے ہودہ باتوں پر ایمان لانے کا حکم دیں۔ بلکہ اللہ و رسول نے ان کتابوں کی بہت سی باتوں کو رد کر دیا ہے اور انکو کفر و ضلالت قرار دیا ہے مزید تفصیل و تشریح میں طوالت ہے اس لیے مندرجہ بالا اجمال ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

خلاصہ ان مضامین سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہوگی کہ مسلمانوں نے جتنا احترام انبیاء سابقین اور کتب منزل من اللہ کا کیا ہے اُتنا خود ان لوگوں سے بھی نہ ہو سکا جو ان انبیاء کی امت میں اپنے کو شامل کرتے ہیں۔

محققین اہل کتاب نے جو کچھ اپنی تحقیقات سے ان کتابوں کی بابت لکھا ہے اس کی ایک مختصر سی جھلک مضامین سابقہ میں دکھلائی گئی ہے۔ اس سے ہر صحیح الدماغ شخص انہی نتائج پر آسکتا ہے کہ ان محققین کی تحقیقات کے بموجب :-

(۱) موجودہ توریت و انجیل از اول تا بہ آخر بالکل قابل اعتبار نہیں۔

(۲) ان کے مصنفین و مؤلفین کا کچھ ٹھیک نہیں اور زمانہ تصنیف و تالیف کا بھی کوئی صحیح تعین نہیں۔

(۳) ان مصنفین و مؤلفین کی اصلی عبارتیں بھی محفوظ نہیں رہیں۔

(۴) ان کتابوں پر اغیار کے کئی حملے ہوتے رہے ہیں اور "احباب" کے بھی جن کی وجہ سے اصلی اور ابتدائی نسخے مفقود ہو چکے ہیں اور اب جو قدیم نقلیں پائی جاتی ہیں ان کے چھٹی یا ساتویں صدی عیسوی سے قدیم تر ہونے پر عیسائی بھی متفق نہیں۔ پھر یہ نسخے بھی باہم مختلف

ہیں اور اختلافات کی تعداد بقول اہل کتاب ہی کے لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ یہ سب
قرات یا کتابت ہی کے اختلاف نہیں بلکہ اہم اور اصولی امور میں بھی شدید اختلافات
واقع ہوگئے ہیں جن کا دور کرنا اصلی نسخوں کے فقدان کی وجہ سے اب محال ہے۔ ان اختلافات
نے ان بنیادی اصولوں ہی کو بدل ڈالا جن پر اصولاً مذاہب حقہ کی بنیاد ہوا کرتی ہے۔
(۵) آجکل ان کتابوں کے ترجموں ہی سے سابقہ رہتا ہے اور ان ترجموں میں بھی بکثرت
غلطیاں ہیں جن کی اصلاح اب بوجہ اصل کے ضائع ہو جانے کے ناممکن ہوگئی ہے۔
(۶) ان جملہ تغیرات کی بنا پر موجودہ توریت و انجیل کو وہ توریت و انجیل نہیں کہہ سکتے
جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائیں۔

باوجود ان تمام خرابیوں کے جن کے اعتراف پر علماء اہل کتاب مجبور ہیں مسلمان علماء اس
درجہ احتیاط سے کام لے رہے ہیں کہ وہ متفقہ طور پر یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ :-

(۱) توریت و انجیل کو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر جو اللہ کے پیغمبر
تھے نازل فرمایا۔

(۲) موجودہ توریت و انجیل میں جتنا حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس پر ہم ایمان لائے
اور اس کا سچا ہونا ہم تسلیم کرتے ہیں۔

(۳) ان میں جو کچھ قرآن وحدیث کے خلاف ہے ان کو بشہادت قرآن وحدیث ہم الحاقی
سمجھتے ہیں۔ اور جن عبارتوں سے اللہ تعالیٰ کی توہین لازم آتی ہے یا انبیاء علیہم السلام
کی بے احترامی پائی جاتی ہے یا ادیان حقہ کے بنیادی اصولوں میں تبدیلی واقع
ہوجاتی ہے ان کو ہم توریت و انجیل سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۴) ان کتابوں کی وہ باتیں جن پر قرآن وحدیث ساکت ہیں ہمارے لیے بھی سکوت

کا مطالبہ کرتی ہیں اس لیے ہم اُن کی نہ تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب۔

گویا عیسائی تحقیقات پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہماری کتابوں کی ایک بات بھی نہ مانو۔ مگر اسلامی حق پسندی کہتی ہے کہ نہیں۔ ایسا نہ ہوگا۔ اِن کتابوں میں جو باتیں قابل قبول ہیں انہیں ہم قبول کرتے ہیں اور جو باتیں قابل قبول نہیں ان سے ہم کنارہ کرتے ہیں۔

(باقی)

اہل کتاب اور ایمان بالرسالت

(۲)

(از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی اے ہوم ڈپارٹمنٹ نئی دہلی)

حقیقت یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت اہل کتاب کے معتقدات میں ایسی باتیں آچکی تھیں کہ ان میں اور دیگر کفار و مشرکین میں کوئی فرق ہی نہ رہا تھا۔ آج اپنے زمانے میں ہی دیکھیے۔ جو جو اقوام اپنے آپ کو حامل کتاب و شریعت سمجھتی ہیں بنیادی عقائد میں بھی، ایمان باللہ و یوم آخر کی نسبت ان میں ایسے اصول پائے جاتے ہیں جو کسی صورت میں بھی قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں۔ بلکہ صریحاً انہی لوگوں سے ملتے ہیں جنھیں قرآن کافر و مشرک قرار دیتا ہے۔ انبیاء کرام کو ابناء اللہ بنا دینا، یا انہیں اوتار یعنی عین خدا سمجھنا، ان کے مجسموں کی پرستش کرنا، اعتقاد آخرت میں مکافات عمل کے بجائے کفارہ کے عقیدہ کو اصل دین قرار دینا، یا یہ کہہ دینا کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ، اور بلا عمل جنت کے اجارہ دار بن بیٹھنا، قطعاً دین فطرت کی تعلیم نہیں قرار دیجا سکتی۔ اس لیے ایمان کتب و رسل تو ایک طرف، جہاں تک ایمان باللہ و یوم الآخر کا تعلق ہے، اہل کتاب اور کفار میں کوئی فرق ہی نہ رہا تھا۔ اور نہ ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا (۴: ۸)

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ ملا ہے۔ وہ جبت اور شیطان کو مانتے ہیں اور کفار کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ لوگ بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ راہ راست پر ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی۔ اور جس کو خدا ملعون بنادے اس کا تم کوئی حامی نہ پاؤ گے

دوسری جگہ ہے :-

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۔ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۔ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۵: ۱۰)

بیشک وہ لوگ کافر ہو چکے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔ حالانکہ مسیح نے خود کہا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے بیشک جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنائیگا سو اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت کو حرام کر دیگا۔ اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں بلاشبہ وہ لوگ بھی کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔ حالانکہ بجز ایک معبود کے اور کوئی معبود نہیں اور اگر یہ لوگ اپنے معتقدات سے باز نہیں آئیں گے تو جو ان میں سے کافر رہیں گے ان پر دردناک عذاب واقع ہوگا۔

اب ظاہر ہے کہ نصاریٰ الوہیت مسیح اور تثلیث کو تو جزو دین (بلکہ اصل دین) سمجھتے ہیں اور جو اناجیل ان کے پاس موجود ہیں ان میں یہ عقیدہ اس طرح داخل ہو چکا ہے کہ گویا وہ من جانب اللہ ہے۔ اب ان عقائد سے ان کے باز آنے کی کیا صورت ہے؟ قرآن کا دعویٰ ہے کہ مسیحؑ کی تعلیم نہیں ہے، الحاق ہے، تعلیم نہیں ہے۔ اب اصل تعلیم وہ کہاں سے لائیں۔ ان عقائد کی اصلاح کس طرح کریں۔ تاوقتیکہ وہ اپنی کتابوں کو محرف مان کر ان کو چھوڑ نہ دیں ان عقائد سے کس طرح منہ موڑ سکتے ہیں یہی وہ چیز ہے جس کے لیے قرآن کریم انہیں تجدید ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ صرف نصاریٰ ہی نہیں، دوسری جگہ یہود و نصاریٰ ہر دو کے متعلق ہے:-

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۔ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۔ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

یہود کہتے ہیں کہ عزیر ابن اللہ ہے۔ نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ یہ ان کے منہ کی بنائی ہوئی باتیں ہیں یہ تو بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگ گئے جو ان سے پہلے کافر

مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۹: ۵)۔ ہو چکے ہیں خدا ان کو غارت کرے۔ یہ کدھر الٹے جا رہے ہیں۔

فرمایئے کہ اللہ پر ایمان کے بارے میں کفار اور ان اہل کتاب میں کیا فرق ہے۔ قرآن خود شہادت دے رہا ہے کہ یہ انہی لوگوں کے سے معتقدات ہیں جو کافر ہو چکے ہیں۔ اندریں حالت قرآن کس طرح سے ان کے اس ایمان کو صحیح ایمان تسلیم کرے۔

اللہ اور آخرت پر ایمان کو جس صورت میں انہوں نے مسخ کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ خدا کا خوف ان کے دل سے اٹھ جاتا اور وہ بداعمالیوں میں الجھ کے رہ جاتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا حتی کہ مسلمانوں کی توجہ خاص طور پر ان کی اس حالت کی طرف منعطف کرائی گئی ہے۔ فرمایا۔

اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۔ (۲: ۵)

کیا ایمان والوں کے لیے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو حق کے ساتھ نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے قبل کتاب ملی تھی۔ پھر ان پر زمانہ گذر گیا۔ اور ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔

صحیح تعلیم کے فقدان کی وجہ سے ان کے عقائد میں تبدیلی ہوئی۔ اور یہ مسلم ہے کہ جب کسی قوم کے عقائد ہی بگڑ جائیں تو اعمال صالح کیسے رہ سکتے ہیں۔ عقائد و اعمال کی اسی اصلاح کے لیے قرآن کریم نازل ہوا۔ چونکہ اہل کتاب گویا اسی برادری کے افراد تھے، ان کے پاس یہ روشنی پہلے پہنچ چکی تھی۔ ان کے پاس کتابوں میں اس آنے والے رسول کا ذکر موجود تھا۔ اس لیے بمقابلہ کفار و مشرکین کے جن کے کان اس صوت سرمدی سے غیر مانوس اور جن کی آنکھیں نور ایزدی سے ناآشنا تھیں اہل کتاب کو جلدی حق قبول کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن تعجب کہ انہوں نے ان سے بھی زیادہ مخالفت کی چنانچہ قرآن کریم نے اسی ظلم کی طرف انکو توجہ دلائی ہے۔ فرمایا۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ

اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے، جو تصدیق

ولا تكونوا اول كافر به ۔ (۲:۵)

کرتی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے (یعنی توریت کی) اور تم سب سے پہلے اس سے انکار نہ کرو۔

دوسری جگہ یہی دعوت سختی کے ساتھ دی ہے کہ اہل کتاب کا قرآن سے انکار محض ضد اور نفسانیت پر مبنی ہے۔

يايها الذين اوتوا الكتب امنوا بما نزلنا مصدقا لما معكم من قبل ان نطمس وجوها فنردها على ادبارها ۔ او نلعنهم كما لعنا اصحب السبت ۔ وكان امر الله مفعولا ۔ (۴:۷)

اے اہل کتاب اس کتاب پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے نازل کیا ہے جو تصدیق کرتی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے قبل اس کے کہ ہم چہروں کو مسخ کر دیں۔ اور ان کو الٹی جانب کر دیں یا ان پر ہم ایسی لعنت کر دیں جیسی اہل سبت پر لعنت کی تھی اور اللہ کا حکم پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔

سورۂ مائدہ رکوع ۹ میں ہے۔

ولو ان اهل الكتب امنوا واتقوا لكفرنا عنهم سيئاتهم ولادخلنهم جنت النعيم

اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم فوراً ان کی برائیاں معاف کر دیتے اور ضرور ان کو چین کے باغوں میں داخل کرتے۔

ایک دفعہ پھر یہ پیش نظر رکھیے کہ اس ایمان کے معنی محض مان لینے کے ہی نہیں بلکہ رسول اللہ کے فیصلے کو ہر معاملے میں قول ناطق تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے یعنی اتباع رسول کے بغیر ایمان حاصل ہی نہیں ہو سکتا

فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما (۴:۹)

قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہیں ہو سکتے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ کو حکم مان لیں پھر آپ جو فیصلہ کریں اس کے خلاف اپنے دلوں میں ذرا بھی خلش نہ محسوس کریں۔ اور پورے طور پر تسلیم کر لیں۔

اور رسول اللہ سے فرمایا کہ ان لوگوں کے فیصلے قرآن کے مطابق کیا کریں، اس لیے کہ قرآن کے اندر وہ تمام صداقتیں موجود ہیں۔ جو پہلی کتابوں میں آتی رہی ہیں اور جواب اہل کتاب کے پاس موجود نہیں ہیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۔ (۵: ۷)

اور ہم نے آپ کے پاس یہ کتاب بھیجی ہے جو خود بھی حق ہے اور جو اس سے پہلے کتابیں آچکی ہیں ان کی تصدیق کرتی ہے۔ اور ان کتابوں کی محافظ ہے آپ ان کے باہمی معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے مطابق فیصلہ کیا کریں اور یہ جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر ان کی خواہشوں پر عملدرآمد نہ کیجیے۔

یہی نہیں بلکہ مسلمانوں سے فرمایا کہ دیکھنا کسی معاملہ میں اہل کتاب کا اتباع نہ کرنا۔ اس اتباع کے معنی یہ ہوں گے کہ تم حق کو چھوڑ کر باطل کے پیچھے لگ جاؤ گے۔ اور یہی کفر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۔ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (۳: ۱۱)

اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے کسی ایک فرقہ کا بھی کہا مانو گے تو وہ لوگ تمہیں تمہارے ایمان لائے پیچھے کافر بنا دیں گے اور تم کفر کیسے کر سکتے ہو حالانکہ تم کو اللہ کے احکام سنائے جاتے ہیں اور تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں اور جو شخص اللہ کو مضبوط پکڑتا ہے تو وہ ضرور راہ راست کی طرف ہدایت کیا جاتا ہے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اہل کتاب سے ایمان کا مطالبہ ہے ایسے ایمان کا کہ جس میں اتباع رسول و قرآن ضروری ہے ان کے معاملات کا فیصلہ از روئے قرآن کیا جانا ضروری ہے یعنی شریعت قرآنی کی پابندی ان پر لازمی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کے کفر میں کوئی شک نہیں۔ بلکہ ان کا کفر متعدی ہے اور مسلمانوں کو ان کے ہر ایک گروہ کے اتباع سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی سچی سچی تعلیمات اور ان تعلیمات کے معلم موجود ہیں، اور اہل کتاب کے پاس نہ ان کی اصل تعلیم موجود ہے نہ پیغمبر کہ ان کی غلطیوں کی اصلاح کر دے

ان کی تلبیس وتحریف کو ظاہر کردے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان آیات بینات کی موجودگی میں اہل کتاب کے لیے ایمان نہ لانے کی کونسی دلیل پیش کی جا سکتی ہے قرآن نے تو مسلمانوں کو ان کی دوستی سے بھی منع فرمایا ہے کہ قلبی تعلقات سے بھی عقائد پہ بڑا اثر پڑا کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (۵:۸)

اے ایمان والو تم یہود ونصاری کو دوست نہ بناؤ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کریگا وہ انہی میں سے ہوگا بیشک اللہ تعالیٰ ظالمین کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا۔

یہی نہیں بلکہ جن حالات کے تحت کفار ومشرکین سے جہاد وقتال کا حکم ہے ان میں اہل کتاب سے بھی قتال کا حکم ہے۔ فرمایا۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (۹:۲۹)

اہل کتاب جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ روز آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا اور رسول نے حرام بتایا ہے، اور نہ سچے دین کو ہی قبول کرتے ہیں، ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہوکر جزیہ دینا قبول کریں۔

اس آیت سے حسب ذیل اہم نتائج مستخرج ہوتے ہیں۔

(۱) اہل کتاب کے ایمان باللہ ویوم الآخر کو ایمان تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ایمان سے مقصود صرف یہی نہیں کہ محض ہستی باری تعالیٰ، یا آخرت کے وقوع کے امکان کو ہی تسلیم کر لیا جائے۔ بلکہ صحیح ایمان یہ ہے کہ ذات وصفات باری تعالیٰ کے متعلق ایسا تصور قائم کیا جائے جو ہر قسم کے شرک خفی وجلی سے منزہ ہو، اور حقیقت یہ ہے کہ باری تعالیٰ کا تصور جس رفعت وتقدس کے ساتھ قرآن کریم نے متعین فرمایا ہے ایسا اور کہیں نہیں ملتا۔ اس لیے اس تصور کے علاوہ جس قسم کا بھی تصور ہوگا، ایمان نہیں کہلایا جا سکتا، ورنہ اگر محض خدا کی

ہستی کے ماننے کا نام ہی ایمان ہو تو دنیا میں سوائے چند دھریوں کے جو خدا کی ہستی ہی کے منکر ہیں کافر تو کہیں ملتا ہی نہیں۔ اسی طرح اگر ایمان آخرت سے مراد ایک دوسری زندگی کے وقوع کا امکان ہی ہو تو سوائے مغرب کے مادیین کے اور کوئی اس کا منکر بھی نہیں ملیگا۔ آخرت کا ایمان بھی انہی شرائط کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے جو قرآن کریم نے مقرر فرمائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب کے ایمان باللہ وآخرت کو قرآن نے ایمان تسلیم نہیں کیا

(۲) ایمان باللہ وآخرت کے ساتھ ہی ساتھ شریعت اسلامی یعنی خدا و رسول کی تحریم و تحلیل پر کاربند ہونا بھی اہل کتاب کے لیے ضروری ہے۔

۳- ان چیزوں کو اپنے اپنے طور پر صحیح تسلیم کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ دین الحق (سچے دین) کو قبول کرنا بھی لازمی ہے

ان تصریحات کو سامنے رکھ کر دیکھیے کہ قرآن کریم کی رو سے اہل کتاب کے لیے ایمان لانا، دائرہ اسلام میں داخل ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کفار و اہل کتاب میں کچھ فرق ہی نہیں سمجھتا، سوائے اس کے کہ چند معاشرتی آئین میں انھیں دیگر کفار پر ذرا سی ترجیح دی گئی ہے یعنی ان کے ہاں کا کھانا جائز ہے اور ان کی پاک دامن عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت ہے اور یہ اس لیے کہ۔

گو واں نہیں، یہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

ان توضیحات کے بعد اب ہم ان آیات کو لیتے ہیں جن سے اہل کتاب کے ایمان کے حق میں استدلال لایا جاتا ہے۔ گزشتہ دو ایک سال میں جتنے اعتراضات نظر سے گزرے ہیں، ان میں تین چار آیات مشترک دکھائی دی ہیں۔ انہی آیات کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس آیت سے استدلال لایا جاتا ہے۔

قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاۗءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ

(اے رسول) اہل کتاب سے کہدیجیے کہ آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے۔ یہ کہ ہم بجز اللہ کے

شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ
اللّٰهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ
(۳ : ۷)

کسی اور کی عبادت نہ کریں۔ اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے۔ اللہ کو چھوڑ کر۔ پھر یہ لوگ اعراض کریں تو کہہ دیجیے کہ تم گواہ رہو۔ ہم تو ماننے والے ہیں۔

اس سے نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کتاب سے صرف عقیدۂ توحید کا مطالبہ ہے، ایمان بالرسالت کا نہیں ہے یعنی اگر وہ شرک کو چھوڑ دیں، تو قرآن انہیں پھر کسی اور چیز کی دعوت نہیں دیتا، اور ان سے مزید تعرض نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم سے استنباط نتائج کے صحیح اصول کو نظر انداز کر دینے سے ہم اس قسم کی الجھنوں میں پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کریم سے صحیح مفہوم اخذ کرنے کے لیے ہمیشہ اس اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جہاں تک ہمیں نص قرآنی لے جاتی ہو، صرف وہیں تک چلیں۔ اس کے بعد اپنے ذہن سے قیاس آرائیاں شروع کر کے مزید نتائج اخذ کرتے چلے جائیں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھنے کے لیے بھی قرآن کریم سے ہی استشارہ کریں۔ پھر معاملہ صاف ہو جائیگا۔ آیت محولہ صدر میں اہل کتاب کو عقیدہ توحید کی دعوت دی گئی ہے۔ یہاں تک تو قرآن کریم نے بیان فرمایا۔ اب اس کے بعد ہمارے ذہن نے اضافہ شروع کر دیا کہ "لہذا" اس سے ثابت ہوا کہ اہل کتاب سے اس کے سوا اور کوئی مطالبہ ہی نہیں۔ بس اسی "لہذا" میں آکر انسان قرآن سے دور جا پڑتا ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی دوسرے مقام پر اس "لہذا" کے خلاف کوئی آیت موجود ہوتی ہے، تو یا تو اسے موڑ توڑ کر اس پر منطبق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور اگر اس میں ناکامی ہوتی ہے، تو قرآن میں تضاد کا شبہ ہونے لگ جاتا ہے۔ حالانکہ جس چیز کو وہ قرآن کا تضاد سمجھتے ہیں، وہ در اصل قرآن کا تضاد نہیں، بلکہ قرآن کا ان کے "لہذا" سے تضاد ہوتا ہے یہی بنیادی غلطی آیت مذکورہ کے اخذ مفہوم میں ہوتی ہے۔ بات قاعدے کی یہی ہے کہ جب بھی مخاطب سے بحث و مناظرہ، یا دعوت و تبلیغ کا موقع ہوتا ہے، تو سب سے پہلے امور مشترکہ فیما بین کو طے کر کے الگ رکھ لیا جاتا ہے اور اس کے بعد امور متنازع فیہ کی بابت ذکر شروع ہوتا ہے اس آیت میں تبلیغ و دعوت کا یہی پہلا درجہ دکھلایا گیا ہے جس میں امر مشترک یعنی عقیدہ توحید کو سب سے پہلے طے کر لینے کی

دعوت دی گئی ہے۔ اس کے بعد معاملہ آگے بڑھے گا، جو قرآن کے اسلوب کے مطابق دوسرے مقامات سے مل سکے گا معترضین تمام بحث کا خاتمہ اسی پہلے درجہ میں کر دیتے ہیں، اور اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ بس اہل کتاب سے اس کے سوا کوئی مطالبہ ہی باقی نہیں رہتا۔ ذہن میں اس نتیجہ کو راسخ کر لینے کے بعد اب سینکڑوں دوسری آیات جن سے اہل کتاب سے ایمان بالرسالت کا مطالبہ صاف صاف پایا جاتا ہے اسی سیدھی تاویلات کی تختۂ مشق بنائی جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر استنباط نتائج کا یہی اصول صحیح ہو جو انہوں نے قائم کر رکھا ہے تو فرمائیے کہ سورۂ کافرون سے وہ کیا نتیجہ اخذ کریں گے جس میں مذکور ہے کہ :-

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ۔ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ۔ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ۔ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔

کہہ دیجیے کہ اے کافرو! نہ تو میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرنے والا ہوں اور نہ تم میرے معبود کی عبادت کرنے والے ہو نہ میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرنے والا ہوں نہ تم میرے معبود کی۔ تمہارے اعمال کی جزا تمہارے لیے، میرے کی میرے لیے

ان اصول استنباط کے مطابق تو اس آیت سے ظاہر ہے کہ کفار سے کسی چیز کا مطالبہ ہی نہیں کیا گیا ان سے صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جن معبودان باطل کی تم پرستش کر رہے ہو، کرتے رہو، نہ میں ان کی پرستش کرنے والا ہوں، نہ تم ان کو چھوڑ کر میرے خدا کی عبادت کرنے پر رضامند ہو، لہذا تم اپنے حال راضی ہم اپنے حال خوش۔ اللہ اللہ خیر صلاح لیکن ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ کسی صورت میں بھی صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے بعد تو نہ صرف نزول قرآن و بعثت نبی اکرم ہی بے معنی ہو جاتی ہے، بلکہ قرآن بنیادی طور پر ہی متضاد صورتوں کو پیش کرنے والا نظر آنے لگ جاتا ہے۔ صحیح نتیجہ اخذ کرنے کے لیے وہی اصول صحیح ہے جو اوپر گذارش کیا گیا ہے۔ اس سورت میں کفار سے قطع تعلق کا اعلان ہے۔ اس کے بعد ان سے کیا طرز عمل اختیار کیا جائے گا؟ اس کی بابت آپ کو یہاں سے نہیں بلکہ قرآن کے دوسرے مقامات سے دریافت کرنا ہوگا۔ اسی طرح اہل کتاب والی آیت میں ان سے صرف قدر مشترک کو طے کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کیا مطالبہ ہے؟ اس کے متعلق قرآن کریم سے ہی استصواب

کرنا چاہئے۔ اور یوں بھی دیکھا جائے تو یہ پہلا مطالبہ ہی اتنا اہم ہے کہ اگر وہ اسے تسلیم کرلیں تو پھر ان کی عیسائیت اور یہودیت میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔ ان کو تو پہلے چھوڑنا ہوگا جب کہیں قرآن کا مطالبہ توحید پورا ہوسکیگا۔

اب اس آیت کو لیجیے۔

لَيْسُوا سَوَاءً ۔ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُوْنَ اٰيَاتِ اللّٰهِ اٰنَاءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۔ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ اُوْلٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ۔ (۳ : ۱۲)

سب اہل کتاب کا حال یکساں نہیں ۔ اہل کتاب میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو کھڑی رہتی ہے اور اللہ کی آیات راتوں میں تلاوت کرتی اور سجدے کرتی ہے یہ لوگ اللہ پر اور قیامت والے دن پر ایمان بھی رکھتے ہیں، نیک کام کرنے کا حکم کرتے ہیں، اور برائیوں سے روکتے ہیں، اور نیک کاموں میں دوڑ کر (جاتے ہیں)، یہ لوگ صالحین ہیں جیسے اور جو نیک کام یہ کرتے ہیں، اس (کی جزا) سے محروم نہ رکھے جائیں گے اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔

اس آیت کے دو ٹکڑے زیر بحث ہیں (يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں)۔ اور (وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ (کہ وہ جو نیک کام کرتے ہیں، ان کے اجر سے محروم نہ رکھے جائیں گے)۔ اس سے نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کتاب میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے ایمان کو قرآن تسلیم کرتا ہے، اور ان کے اعمال کو کفار کے اعمال کی طرح باطل قرار نہیں دیتا، بلکہ ان کی جزا کا وعدہ کرتا ہے۔

یہ نتائج بوجوہ غلط ہیں۔ سیاق کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب نے آج سے نہیں کچھ شروع ہی سے ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ جب بھی اللہ کی آیات ان کے پاس آتی ہیں تو یہ ان سے انکار کردیتے ہیں (يَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ) اور جونہی آتا ہے یہ اس کے قتل کے درپے ہوجاتے ہیں (يَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ الْحَقِّ) لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ یہ کلیہ نہیں۔ بلکہ اس میں مستثنیات بھی ہیں۔ انہی میں سے وہ لوگ بھی ہیں کہ جب

اللہ کی آیات ان کے پاس پہنچتی ہیں تو وہ ان سے انکار نہیں کرتے بلکہ انکو قبول کر لیتے ہیں، ان پر ایمان لے آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے بعد یہود و نصاریٰ اپنے اپنے ہاں کی مذہبی تعلیم سے تو انکار کرتے ہی نہ تھے۔ وہ تو اب اس کو مانتے تھے۔ اب اس تکفیر کرنے والی جماعت کے بعد جس جماعت کا ذکر آیا ہے، جو تمیز ہے، وہ ایسی جماعت ہے جو اس پیغام خداوندی کی تکفیر نہیں کرتی، بلکہ اس پر ایمان لے آتی ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہو چکی ہے۔ انہی کے ایمان کو ایمان باللہ و الآخرۃ کہا گیا ہے اور اس ایمان کی بدولت (۳:۹۰)
ان کے اعمال کو حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (ان کے اعمال غارت ہو گئے) سے مستثنیٰ کر دیا ہے اس لیے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ تمام اہل کتاب کے متعلق یہ موجود ہے کہ۔ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (یہ لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے) اس لئے کہ۔ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ (یہ سچے دین کو قبول نہیں کرتے) تو جن اہل کتاب کے متعلق اتنا واضح طور پر یہ کہہ دیا گیا ہو انہی کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس جماعت سے لامحالہ وہی جماعت مقصود ہے جو ایمان لا کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکی تھی۔ ہمارے اس دعوے کی دلیل اسی سورۂ آل عمران کے آخر میں موجود ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۳ : ۲۰۰)

اور یقیناً اہل کتاب میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو کتابیں ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ اللہ سے ڈرتے ہوئے اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر نہیں بیچ دیتے۔ ایسے لوگوں کا اجر ان کے اللہ کے ہاں سے ضرور ملیگا۔ اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔

اہل کتاب کی اسی جماعت کا ذکر ہے۔ اللہ کے ایمان کے ساتھ۔ قرآن کریم کے ایمان کی بھی تصریح ہے اور اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اس وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ کی تفسیر ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن کریم پر ایمان لانے والی جماعت مسلمان اہل کتاب کی ہی جماعت تھی۔

پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ جس جماعت کا ذکر آل عمران کے رکوع ۱۲ میں کیا گیا ہے ان کا فرض منصبی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی بتایا گیا ہے۔ اور یہ فریضہ صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے جیسا کہ کئی ایک مقامات سے ظاہر ہے۔ مثلاً دو تین آیات پہلے مذکور ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔

مسلمانو! تم بہترین اُمت ہو جو تمام انسانوں کے لئے علیحدہ کی گئی ہے تاکہ تم نیک کاموں کا حکم کرو۔ اور بُرے کاموں سے روکو۔ اور خدا پر ایمان رکھو۔

اور اس کے ساتھ ہے کہ:۔

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ

اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا ان میں سے کچھ تو ایمان لے آئے ہیں۔ اور اکثر فاسق ہیں

اب ظاہر ہے کہ (۳: ۱۲) میں جس جماعت کا ذکر ہے کہ ان کا منصب حیات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے وہ مسلمانوں کی ہی جماعت ہو سکتی ہے یا غیر مسلم اہل کتاب کی؟ پھر ان آیات کے آخر میں ہے وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ۔ اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ اور متقین کی تعریف شروع قرآن کریم میں گذر چکی ہے کہ:۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ

اور جو لوگ کہ ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو تم پر نازل کی گئی ہے۔ اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے آ چکی ہیں۔ اور وہ آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

اب بھی اگر شبہ باقی رہ جائے تو شرح صدر کرنے والی تو خدا کی ہی ذات ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ:۔

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ ان میں سے

مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ کچھ تو ایمان لے آئے ہیں۔ اور اکثر فاسق ہیں۔

منہم المؤمنون سے مراد یہ ہے کہ "ان میں کچھ تو مومن ہیں۔ اور اکثر فاسق ہیں" یعنی قرآن ان میں بعض کو مومن تسلیم کرتا ہے سو اس کی تکذیب تو خود اس آیت کا Construction کر رہا ہے لو آمن اَهْلُ الْكِتٰبِ ۔ اگر اہل کتاب ایمان لے آتے" میں تمام اہل کتاب کا ذکر ہے۔ اگر ان میں سے بعض کو مومن تسلیم کر لیا جاتا تو سب اہل کتاب کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ان میں سے جو فاسقین تھے انہی کو مخاطب کیوں نہ کیا گیا۔ حالانکہ قرآن کریم میں اسی ایک مقام پر نہیں، بلکہ کوئی بھی ایسا مقام نہیں جہاں اہل کتاب کے کسی ایک حصہ کو مخاطب کر کے ایمان کی دعوت دی گئی ہو۔ اس لیے منہم المؤمنون سے مراد وہی لوگ ہیں جو قرآن کی اصطلاح میں ایمان لا چکے تھے۔ جیسا کہ (۳ : ۲۰) سے ظاہر ہے۔

باقی

تنزیل و تاویل

برزخ

اشاعت گذشتہ میں "عالم برزخ" کے عنوان سے جناب مولانا اسلم جیراج پوری کا طویل مضمون درج کیا جا چکا ہے۔ ان کی کتاب "تعلیمات قرآن" پر تبصرہ کرتے ہوئے برزخ کے متعلق ان کی تاویلات پر میں نے قصداً کوئی اظہار رائے نہ کیا تھا، کیونکہ رسالہ "معارف" میں اس پر مفصل مضامین شائع ہو چکے تھے، اور مجھے امید تھی کہ ان کو دیکھ کر مولانا نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا ہوگا۔ لیکن اب ان کے تازہ مضمون سے معلوم ہوا کہ انھیں ابھی تک اس رائے پر اصرار ہے۔ مزید براں ان کو اس بات پر تعجب بھی ہے کہ میں (مدیر ترجمان القرآن) قرآن کی حمایت و نصرت و اشاعت کا مدعی ہونے کے باوجود ان حضرات کا ہم خیال ہوں جنہوں نے "معارف" میں ان کے خیالات کی تردید کی ہے۔ حالانکہ ان سے زیادہ مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ جن خیالات کی تردید اتنے قوی دلائل سے کی جا چکی ہے، ان پر مولانا کو ابھی تک اصرار ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ شائد میں کوئی ایسی بات نہ کہہ سکونگا جو نیات برزخیہ اور عذاب و ثواب برزخ کے حق میں نہ کہی جا چکی ہو۔ تاہم میں کوشش کرونگا کہ ہر قسم کی تلخ گفتاری سے پرہیز کر کے زیادہ سے زیادہ دلنشین انداز بیان کے ساتھ ان آیات قرآنی کی صحیح تاویل پیش کروں جن کے سمجھنے میں مولانا نے پے در پے غلطیاں کی ہیں۔ اس لیے کہ سابق مضامین میں اگر کوئی قصور تھا تو وہ صرف یہی کہ ان کے لہجہ میں تلخی تھی جس سے مخاطب کی طبیعت مشتعل ہو کر مشاہدہ حق سے پھر جاتی ہے۔

برزخ کا مفہوم | سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ لغت کے اعتبار سے برزخ کا مفہوم کیا ہے۔ دو چیزوں کے درمیان جو چیز واقع ہو، اور ان کو باہم ملنے سے روک دے یا ان کو الگ الگ کر دے وہ عربی زبان میں

"برزخ" کہلاتی ہے، خواہ وہ پردہ یا اوٹ ہو، یا زمانہ، یا کوئی اور شئے۔ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ۔ اور جَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا میں برزخ سے مراد وہ روک ہے جو دو سمندروں کو ملنے سے باز رکھتی ہے۔ ایک حدیث میں ذکر آیا ہے کہ اِنَّهُ صَلّٰى بِقَوْمٍ فَاسْوَى بَرْزَخًا۔ یعنی آپ نے ایک جماعت کو نماز پڑھائی اور قرآن پڑھتے پڑھتے ایک مقام سے سلسلہ منقطع فرما کر دوسرے مقام سے تلاوت شروع کر دی۔ یہاں اس حصہ کو جو چھوڑ دیا گیا تھا "برزخ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں وساوس کو براز خ الایمان کہا گیا ہے یعنی شک اور یقین کی درمیانی حالت۔ مفسرین و ائمہ لغت نے برزخ کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ البرزخ الحاجز والمهلة متقاربات المعنى (آخر) البرزخ ما بين كل شيئين من حاجز (نہایہ ابن اثیر) البرزخ الحاجز والحد بين الشيئين (راغب)۔

اصطلاحی معنی | اسی لفظ کو قرآن مجید نے اصطلاحاً اس مدت یا اس حالت کے لیے استعمال کیا ہے جو انسان کی موت سے لیکر قیامت کے دن تک ہے جس آیت میں یہ لفظ وارد ہے وہ خود اس کے اصطلاحی معنی کو واضح کر رہی ہے:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۲۳: ۶)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ پروردگار مجھے واپس کر دیجیے۔ امید ہے کہ میں اس زندگی میں جس کو چھوڑ آیا ہوں نیک عمل کرونگا۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے اور ان کے آگے ایک برزخ ہے اس دن تک جب کہ وہ اٹھائے جائینگے

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت سے روز قیامت تک جو کچھ ہے اس کا نام برزخ ہے آپ چاہیں تو اسے روک یا آڑ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ آڑ ہے بھی تو میت اور دنیا کے درمیان ہے یا میت اور قیامت کے درمیان ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان ہرگز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں کوئی اشارہ ایسا

نہیں ملتا جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ برزخ میں مردے اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جاتے ہیں۔ یہ محض ایک بے بنیاد قیاس ہے۔

برزخ کی کیفیت اب سوال یہ ہے کہ برزخ کی کیفیت کیا ہے۔ آیا اس میں انسان کے لیے کوئی زندگی ہے یا نہیں؟ وہاں صالحین کے لیے کوئی راحت اور فاسقین کے لیے اذیت ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ برزخ میں نفس انسانی کس حال میں رہتا ہے؟

مولنا اسلم جیراج پوری کا دعوی یہ ہے کہ:-

۱- مرنے والے برزخ میں اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جاتے ہیں اور صرف قیامت کے روز ان کی پیشی ہوگی۔

۲- برزخ مطلقاً عالم ممات ہے جس میں حیات، علم، احساس، شعور کچھ نہیں ہوتا، اور اس لیے عذاب و ثواب، راحت و اذیت بھی وہاں نہیں ہے۔

۳- برزخ میں رہنے سے مراد اللہ کے نوشتے میں رہنا ہے۔ یعنی انسان اس دنیا میں آخری سانس لینے کے بعد معدوم ہو جاتا ہے، اور صرف اس کا اندراج اللہ کے دفتر میں رہتا ہے۔ پھر جب قیامت ہوگی تو ان سب کو دوبارہ زندہ کیا جائیگا جو اس دفتر میں مندرج ہیں۔ پس موت سے لیکر قیامت تک نفس یا روح کی حالت ایک معدومیت اور فنائیت کی حالت ہے، اور اس کے لیے اگر موجودیت ہے تو وہ صرف کتاب اللہ میں ہے۔

۴- صرف وہ لوگ جو فی سبیل اللہ جنگ کرکے مارے جاتے ہیں، اس سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ مرنے کے بعد زندہ رہتے ہیں، اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں نہیں رکھے جاتے، بلکہ اسی وقت حاضر کر دیے جاتے ہیں اور ان کو روزی ملنے لگتی ہے۔

ہم کو دیکھنا ہے کہ یہ دعوی قرآن سے ثابت ہوتا ہے یا نہیں، اور قرآن مجید کی رو سے مذکورۂ بالا سوالات کا صحیح حل کیا ہے؟

موت اور حیات کا مفہوم | اس بحث میں پہلا حل طلب سوال یہ ہے کہ زندگی اور موت سے کیا مراد ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ:۔

كُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ (۲:۳)۔ — تم مردہ تھے پھر تم کو زندہ کیا، پھر وہ تمکو مارتا ہے پھر وہ تم کو جلائے گا۔

اس آیت میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ پہلی موت سے مراد وہ حالت ہے جو قالب خاکی میں نفخ روح سے پہلے تھی جیسا کہ آیت وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ...... ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (۳۲:۱) سے معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ پہلی زندگی سے مراد وہ حالت ہے جو جسم میں روح کے پھونکے جانے کے بعد ہوتی ہے اور جس میں انسان اپنے جسمانی کانوں سے سنتا، جسمانی آنکھوں سے دیکھتا اور جسمانی دل و دماغ سے سوچتا ہے اس کی طرف بھی آیت مذکورۂ بالا اشارہ کرتی ہے۔

۳۔ دوسری موت سے مراد وہ حالت ہے جو جسد خاکی سے نفس یا روح کے سلب کر لیے جانے کے بعد ہوتی ہے۔ اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا (۳۹:۵) اور وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ (۶:۱۱) اسکی دلیل ہے۔

۴۔ دوسری زندگی سے مراد وہ حالت ہے جس میں قیامت کے روز وہی جان جو موت کے وقت جسم سے نکالی گئی تھی دوبارہ جسم میں پھونکی جائیگی۔ اس پر وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (۸۱:۱) اور كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ (۲۱:۷) اور ایسی ہی بہت سی آیات دلالت کرتی ہیں۔

جسمانی موت کے بعد روحانی زندگی | پس معلوم ہوا کہ قرآن مجید نے عموماً موت سے جسم و روح کا انفصال اور زندگی سے جسم و روح کا اتصال مراد لیا ہے۔ لیکن اس معنی میں جس حالت کو وہ موت کہتا ہے اس سے

مراد عدم نہیں ہے، بلکہ وہ بھی ایک طور کی زندگی ہے جس میں روح بولتی اور سنتی اور شعور و ادراک رکھتی ہے چنانچہ خود قرآن مجید سے اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ دیکھیے پہلی موت کے دور کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ:-

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (۷: ۱۷۲)

اور جب کہ تیرے رب نے بنی آدم سے ان کی پیٹھوں میں سے انکی ذریت کو نکالا اور خود ان کے اوپر ان کو گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا ہاں، ہم گواہ ہوئے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب روحیں جسموں میں پھونکی نہ گئی تھیں، اور جب کہ ان پر موت طاری تھی اس وقت بھی وہ اس معنی میں مردہ نہ تھیں کہ ان میں سماعت اور گویائی اور علم و شعور نہ تھا حق تعالیٰ نے ان سے جو سوال کیا اس کو انھوں نے سنا، اس کا جواب دیا، اور جواب علم کی بنا پر دیا۔ پس وہ موت محض اجساد سے جدائی کا اعتبار کرتے ہوئے تھی۔ ورنہ حقیقت میں وہ بھی زندگی ہی تھی، کیونکہ علم اور سمع اور گویائی کی صفات زندگی ہی میں پائی جاتی ہیں۔

پھر دوسری موت کی حالت میں بھی ارواح کا ان اوصاف سے متصف ہونا، قرآن مجید کی متعدد آیات سے ثابت ہوتا ہے۔ فرمایا:-

حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۲۳: ۶)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ پروردگار! مجھ کو واپس کر دیجیے۔ امید ہے کہ میں اس زندگی میں جس کو میں چھوڑ آیا ہوں نیک عمل کرونگا ہرگز نہیں یہ تو ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے اور ان کے آگے برزخ ہے اٹھائے جانے کے دن تک۔

اس آیت میں اِرْجِعُوْنِ، اور فِيْمَا تَرَكْتُ اور مِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذکر اس حالت کا ہے جب دنیا چھوٹ چکی ہے، برزخ اس کے اور دنیا کے درمیان

حائل ہو چکی ہے، اور دنیا میں رہنے کا نہیں بلکہ دنیا میں واپس جانے کا مسئلہ درپیش آگیا ہے۔ اس حالت موت میں انسان اپنے رب سے کلام کرتا ہے اور دنیا میں واپسی کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں خوف و رجا کے جذبات ہوں گے، اپنی دنیوی زندگی کے کارنامے اس کو یاد ہوں گے، ان پر ندامت اور مستقبل کے خطرات کا احساس ہوگا، اپنے پروردگار کو وہ جانتا ہوگا، اور اس میں گویائی کی قوت بھی ہوگی جبھی تو وہ ایسی بات کہے گا۔ کیا یہ مطلق عالم ممات ہو سکتا ہے جس کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ اس میں حیات کا کوئی شائبہ نہیں؟

دوسری آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں:-

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۶۳ : ۲)

اور خرچ کرو اس رزق میں سے جو ہم نے تم کو عطا کیا ہے قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے پھر وہ کہے کہ پروردگار کاش تو مجھے تھوڑی مہلت اور دیتا کہ میں خیرات کرتا اور صالحین میں سے ہوتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا (۴ : ۱۴)

جن لوگوں کی جانیں ملائکہ نے اس حال میں قبض کیں کہ وہ کفار کی سرزمین میں رہ کر اپنے اوپر آپ ظلم کر رہے تھے ان سے ملائکہ نے کہا کہ تم یہ کس حال میں پڑے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ ہم زمین میں بے بس تھے فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟

حَتّٰىٓ اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ

یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے فرستادے ان کی روح قبض کرنے کو پہنچ گئے تو کہا کہ کہاں ہیں وہ تمہارے معبود جن کو تم خدا کے سوا پکارتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ وہ ہمارا

اِنَّهُمْ كَانُوْا كَافِرِيْنَ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ (۷ : ۴)

ساتھ چھوڑ گئے اور انہوں نے اپنے اوپر گواہی دی کہ وہ کافر تھے۔ خدا نے کہا کہ تم بھی ان قوموں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ جو از قسم جن و انس تم سے پہلے گذر چکی ہیں

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶ : ۴)

جن لوگوں کی جانیں ملائکہ اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک تھے، تو ان سے کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو جنت میں داخل ہو اپنے ان اعمال کے بدلے میں جو تم کرتے تھے۔

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (۱۶ : ۴)

جن لوگوں کی جانیں ملائکہ اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرنے والے تھے، تو وہ ان سے دوستی ڈالیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو کوئی برا عمل نہ کرتے تھے۔ ان سے کہا جائیگا کہ ہاں خدا جانتا ہے جو کچھ تم کرتے تھے پس تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جہاں تم ہمیشہ رہو گے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (۸ : ۷)

اور کاش تو دیکھتا جب کہ ملائکہ ان لوگوں کی جانیں قبض کرتے ہیں جنھوں نے کفر کیا ہے، وہ ان کو آگے اور پیچھے سے مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ عذاب آتش کے مزے چکھو۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عرف عام میں جس انفصال روح و جسم پر لفظ موت کا اطلاق ہوتا ہے وہ ایسی موت نہیں ہے جس میں مطلق کسی قسم کا احساس و شعور اور شائبہ حیات موجود نہ ہو۔ برعکس اس کے اس حالت میں بھی روح میں زندگی کے وہ تمام آثار موجود ہوتے ہیں، جو جسمانی زندگی میں ہوا کرتے ہیں البتہ ان کا طور و انداز بدلا ہوا ہوتا ہے، اور جسمانی زندگی سے وہ حالت مختلف ہوتی ہے،

عرفی موت پر زندگی کا اطلاق | چونکہ انسان کے نزدیک زندگی سے مراد جسمانی زندگی ہے، اور موت سے مراد

جسمانی موت ہے، اور اسی مفہوم کے لیے انسانی زبان میں موت اور حیات کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے حق تعالیٰ نے بھی اپنے کلام میں عموماً موت اور حیات کو جسمانی موت اور جسمانی حیات کے معنی میں استعمال کیا ہے لیکن بعض مواقع ایسے بھی آئے ہیں جہاں انسان کے اس جاہلانہ خیال کی تردید کرنا ضروری ہوگیا کہ زندگی حقیقت میں جسمانی زندگی ہے، اور جسمانی موت حقیقی موت ہے جس میں حیات کا کوئی شائبہ نہیں جب حق کی خاطر جان دینے کا سوال پیش آتا ہے تو یہ جاہلانہ خیال انسان کی ہمت کو پست کردیتا ہے۔ وہ اس وقت اپنی جان قربان کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اگر مارے گئے تو زندگی کے مزے چھوٹ جائیں گے اور جسم سے جان نکلتے ہی ہم فنا ہو جائیں گے۔ ایسے موقع پر حق تعالیٰ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ جس کو تم موت کہتے اور سمجھتے ہو وہ حقیقت میں موت نہیں ہے۔ ہماری راہ میں جان دیکر تم "مطلق عالم ممات" میں نہ چلے جاؤ گے بلکہ پھر بھی زندہ ہی رہو گے اور ہمارے رزق کے مزے اس حال میں بھی تم کو نصیب ہوں گے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ۔ (۳: ۱۷)

اور تو ان لوگوں کو جو خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں مُردہ نہ سمجھ وہ تو زندہ ہیں اپنے رب کے پاس انہیں رزق دیا جاتا ہے

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ۔ (۲: ۱۹)

اور تم ان لوگوں کو مردہ نہ کہو جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں وہ تو زندہ ہیں مگر تم جانتے نہیں ہو۔

ان مواقع پر چونکہ پردہ پڑا رہنے سے ایک بڑی مصلحت فوت ہو رہی تھی، اسلیئے حقیقت کو بے نقاب کردیا گیا۔ مگر غور سے دیکھیے۔ یہ نہیں کہا کہ جو لوگ فی سبیل اللہ مارے جاتے ہیں، ان پر وہ موت طاری نہیں ہوتی جس کو عرف عام میں موت کہا جاتا ہے بلکہ یہ فرمایا کہ ان کی موت کو حقیقی موت نہ سمجھو اور نہ کہو۔ وہ مارے ضرور جاتے ہیں، ان کے جسم سے جان ضرور نکل جاتی ہے۔ وہ دنیا سے رخصت ضرور ہوتے ہیں۔ ان کو دفن بھی کیا جاتا ہے۔ ان کی عورتیں بیوہ اور ان کے بچے یتیم بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کے ترکے تقسیم بھی ہوتے ہیں۔ ان تمام

حیثیتوں سے وہ دنیا اور دنیا والوں کے لیے مرجاتے ہیں۔ مگر اس جسمانی موت کے بعد بھی ایک زندگی ہے جو ان کو حاصل رہتی ہے، اور اس کے بعد بھی اللہ کے رزق اور اس کی بخششوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اگرچہ تم کو اس کا شعور نہیں ہے۔

مولانا اسلم جیراجپوری اس نکتہ کو نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے عرفی موت اور حقیقی موت میں فرق نہ کیا۔ انہوں نے اس مصلحت پر بھی غور نہ کیا کہ خاص شہداء کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے اس فرق کو کس لیے واضح کیا ہے۔ ان کی نظر ان آیات کے معانی تک بھی نہ پہنچ سکی جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرق محض شہداء کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ تمام مرنے والوں کے لیے عرفی موت کے بعد بھی ایک روحانی زندگی ہے جس میں احساس، شعور، سمع، گویائی وغیرہ قوتیں بدستور باقی رہتی ہیں۔ اس پہلی اور بنیادی غلطی نے ان کو پے در پے غلطیوں میں مبتلا کردیا اور آخر تک ان کے قیاسات غلط ہوتے چلے گئے۔

برزخ میں روحوں کے مقامات

جسمانی موت کے بعد روحانی زندگی کا ثبوت مل چکا۔ اب ہم کو آگے بڑھ کر یہ دیکھنا ہے کہ مرنے کے بعد انسانی نفوس کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے اور وہ کہاں رکھی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برزخ میں نفوس کے مقام کا انحصار ان کی دنیوی زندگی کے اعمال پر ہے۔ جو نفوس دنیا میں تقویٰ اور عمل صالح کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں وہ اتنے لطیف ہوجاتے ہیں کہ مقامات رفیعہ کی طرف پرواز کرنے لگتے ہیں۔ جسم سے نکلتے ہی فرشتے ان کو کامیابی کی خوشخبری سناتے ہیں، ان کا نام عالم بالا کے دفتر میں لکھا جاتا ہے، اور یوم الفصل کے انتظار کی مدت وہ ایسی بلند منزلوں میں گذارتے ہیں جہاں ان کو جنت کی خوشبوئیں آتی ہیں، بلکہ درحقیقت وہ جنت ہی کی منازل ہوتی ہیں۔

۱ الَّذِينَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِينَ	جن لوگوں کی جانیں ملائکہ اس حال میں قبض کرتے
يَقُولُونَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ	ہیں کہ وہ پاک تھے، ان سے وہ کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ (۱۶: ۴)
جنت میں داخل ہو اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے تھے

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ (۲۲: ۸)۔

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر مارے گئے یا مر گئے اللہ ان کو اچھا رزق عطا کرے گا اور حقیقت میں اللہ ہی بہتر رزق دینے والا ہے۔ وہ ضرور ان کو ایسی جگہ داخل کرے گا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۔ (۳: ۱۷)

اور یقین رکھو کہ اگر تم راہ خدا میں مارے گئے یا مر گئے تو اللہ کی مغفرت اور رحمت اس مال و دولت سے بہتر ہے جو لوگ دنیا میں جمع کرتے ہیں۔ اور اگر تم مر گئے یا مارے گئے تو اللہ ہی کی طرف لیجائے جاؤ گے۔ [۱]

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۔۔۔۔ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ (۳۶: ۲)۔

اور ایک شخص شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا کہ لوگو! رسول کی پیروی کرو ۔۔۔ میں تمہارے پروردگار پر ایمان لایا ہوں، میری بات سنو (اس پر لوگوں نے اسے قتل کر دیا) [۲] اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا

اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ وَمَآ اَدْرٰىكَ
نیک لوگوں کا دفتر علیین میں ہے اور علیین کو تو کیا جانے

---

۱ اس آیت اور اوپر والی آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام صالحین کے ساتھ ایک ہی معاملہ ہوتا ہے اور اس میں شہید و غیر شہید کا کوئی فرق نہیں ہے۔ نیز مولانا اسلم جیراجپوری کے اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ شہداء کے سوا تمام باقی روحیں برزخ میں اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھی جاتی ہیں۔

۲ قرآن مجید میں اس شخص کے مارے جانے کا ذکر نہیں ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ جو شخص روایات کو ظنی اور ناقابل اعتبار سمجھتا ہو اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس شخص کو جنت میں داخل ہونے کا حکم مرنے کے بعد دیا گیا۔

مَا عِلِّیُّوْنَ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (۹۳) — کہ کیا ہے۔ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی مقربین اس کی نگرانی کرتے ہیں۔

بخلاف اس کے جو لوگ فسق و فجور میں جان دیتے ہیں ان کی روحیں گندی ہو جاتی ہیں ان کے لیے مقامات عالیہ کے دروازے نہیں کھلتے جسم سے نکلتے ہی اُن پر سختیاں شروع ہو جاتی ہیں ان کو ذلت اور مصیبت کے قیدخانوں میں رکھا جاتا ہے جہاں ان کو اپنے ہولناک انجام کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، اور وہ کثافتیں جو دنیوی زندگی کے بُرے اعمال سے انہوں نے سمیٹ لی تھیں ان کو بے چین و بے قرار رکھتی ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ (۷:۵) — جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان کے مقابلہ میں تکبر کیا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے۔

وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ (۸:۷) — اور کاش تو دیکھتا جب کہ ملائکہ ان لوگوں کی جانیں قبض کرتے ہیں جنہوں نے کفر کیا ہے۔ وہ ان کو آگے اور پیچھے سے مارتے جاتے ہیں کہ آگ کے عذاب کا مزا چکھو۔

اِنَّ کِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا سِجِّیْنٌ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸۳) [۱] — بدکاروں کے نام (قیدیوں کے دفتر) سجین میں لکھے جاتے ہیں۔ اور تو کیا جانے کہ سجین کیا ہے۔ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

ان کے علاوہ متعدد آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسقین پر موت کے بعد ہی سختیاں شروع ہو جاتی

---

[۱] مولانا اسلم جیراجپوری نے اس آیت اور اسی سلسلہ کی ایک دوسری آیت کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ علیون کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ یا تو اس سے مراد منازل عالیہ ہیں، یا عالی مقام لوگ۔ اسی طرح سجین سے مراد یا قیدخانہ ہے یا قیدیوں کا گروہ۔ صالحین و ابرار کے نام اس دفتر میں لکھے جاتے ہیں جو علیین کے لیے مخصوص ہے، اور فاسقین و فجار کے نام سجین کے دفتر میں مندرج ہوتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نفوس فنا ہو جاتے ہیں اور صرف رجسٹر میں نام رہ جاتے ہیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی روحیں علیین و سجین میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ مدرسے میں بچہ کا نام لکھا گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بچہ غائب ہو گیا اور صرف اس کا نام رجسٹر میں رہ گیا۔

ہیں۔ مثلاً آل فرعون کے متعلق ارشاد ہے کہ۔

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (۴۰: ۵)

اور آل فرعون کو بُرے عذاب نے گھیر لیا۔ وہ آگ کا عذاب ہے جس پر وہ صبح شام پیش کیے جاتے ہیں۔ اور جب قیامت قائم ہوگی تو حکم دیا جائیگا کہ آل فرعون کو اس سے سخت تر عذاب میں داخل کرو۔

اس آیت کے الفاظ اتنے واضح ہیں کہ مفہوم میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ غرق ہوتے ہی آل فرعون کو بُرے عذاب نے گھیر لیا۔ اب وہ دائماً آگ پر پیش کیے جاتے ہیں اور جب قیامت قائم ہوگی تو اس سے زیادہ سخت عذاب دیا جائیگا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مولانا اسلم جیراجپوری نے پہلے سے چند نظریات قائم کر لیے ہیں جو قرآن مجید کی بعض آیات کے غلط مفہوم پر مبنی ہیں اور اب بجائے اس کے کہ وہ ایسی صاف اور صریح آیات کو دیکھ کر ان نظریات میں ترمیم کرتے، وہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کی تاویل کر کے ان غلط نظریوں کے مطابق ڈھال لیں۔ یہی وہ ذہنیت ہے جو انسان کو قرآن کا صحیح مفہوم سمجھنے نہیں دیتی۔

اسی کے قریب المعنی وہ آیت ہے جو مدینہ اور گرد و پیش کے منافقین کے حق میں نازل ہوئی ہے۔

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۔ (۹: ۱۰۱)

عنقریب ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر وہ زیادہ بڑے عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے۔

یہاں بھی الفاظ صریح اور مفہوم واضح ہے۔ عذاب کے تین مرتبے بتلائے ہیں۔ ایک دنیا کا عذاب کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوئے اور اُن کی ساری تدبیریں ناکام کر دی گئیں۔ دوسرا برزخ کا عذاب۔ اور تیسرا عذاب عظیم جو قیامت کے بعد ہوگا لیکن یہاں پھر مولانا کے نظریات نے ان کو ایک صاف بات سمجھنے سے روک دیا۔

چند غلط نظریات | مولانا کے نظریات میں پہلا نظریہ یہ ہے کہ وہ برزخ کو مطلق عالم ممات سمجھتے ہیں جس میں حیات کا

کوئی شائبہ نہیں اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ برزخ میں نہ راحت ہے اور نہ اذیت لیکن اس کی تائید میں جو آیات انہوں نے پیش کی ہیں وہ ان کے مدعا کی تائید نہیں کرتیں۔ بالفرض اگر قرآن مجید میں مشرکین و کفار کے معبودوں سے مراد انبیاءؑ اولیاءؒ صلحاءؒ اور دوسرے انسان ہیں جو وفات پا چکے ہیں، تب بھی ان آیات سے جو مولینا نے پیش فرمائی ہیں، صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ آدمیوں کی پکار نہیں سنتے" ان کی دعاؤں سے غافل ہیں، اور ان کو جواب نہیں دے سکتے۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ بجائے خود بے حس، بے جان، بے شعور، بے علم اور "بالکل غافل و بے خبر" ہیں؟ اگر وہ اس عالم کی باتیں نہیں سنتے اور اس عالم کے لوگوں کو جواب نہیں دے سکتے، تو اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا جا سکتا ہے کہ جس عالم میں وہ ہیں، وہاں بھی ان میں بولنے اور سننے اور محسوس کرنے کی قوت نہیں ہے؟ پہلے ایک مضمون کی آیات پر غور کیے بغیر ایک غلط نظریہ قائم کرنا، پھر اس نظریہ کی بنا پر دوسری صریح آیات کی تاویل کرنا، اور الفاظ کو ان کے صاف مفہوم سے پھیر تا وہ طریقہ نہیں ہے جس سے آدمی قرآن مجید کے علوم سے استفادہ کر سکتا ہو۔ قرآن مجید ایک جگہ کہتا ہے کہ تم مُردوں کو نہیں سُنا سکتے، اور مردے تمہاری دعاؤں کا جواب نہیں دے سکتے۔ دوسری جگہ وہی قرآن کہتا ہے کہ فرشتے مُردوں سے باتیں کرتے ہیں اور مُردے ان کو جواب دیتے ہیں۔ کیا ان دونوں باتوں میں کوئی تناقض ہے؟ اگر نہیں تو آپ جس طرح پہلی بات کو مانتے ہیں، اسی طرح دوسری کو بھی مانیئے اگر ہے تو تناقض ثابت کیجیے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ "قرآن کی رو سے انسان کے لیے دو ہی موتیں اور دو ہی زندگیاں ہیں"۔ دنیاوی زندگی کے بعد "دوسری زندگی حشر کے دن ملے گی نہ کہ قبر میں۔ لہذا اس دنیاوی زندگی کے منقطع ہو جانے کے بعد اہل برزخ میں مطلقاً زندگی کا کوئی شائبہ نہیں"۔ یہاں دراصل موت اور حیات کا مفہوم سمجھنے میں مولینا سے لغزش ہوئی ہے۔ جس انفصالِ جسم و روح پر لفظ موت کا اطلاق کیا گیا ہے اس کے متعلق مولانا نے فرض کر لیا کہ اس میں مطلقاً زندگی کا کوئی شائبہ نہیں، اور زندگی محض اتصالِ

جسم و روح کا نام ہے لیکن اوپر قرآن مجید کی آیات سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ مفروضہ بالکل غلط ہے۔

تیسرا نظریہ بھی ایسا ہی عجیب و غریب ہے۔ ایک آیت میں وارد ہوا ہے کہ مردے جب حشر کے دن اٹھائے جائیں گے تو کہیں گے کہ "ہائے کس نے ہم کو ہماری خوابگاہ سے اٹھا دیا" بعض اور آیات میں ہے کہ دنیوی زندگی اور قیامت کے درمیان وہ زیادہ سے زیادہ ایک گھڑی کا فصل سمجھیں گے۔ اس سے مولانا نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ برزخ میں مردے بالکل غافل و بے خبر پڑے ہوئے ہیں، اور ان کو زمانے کا مطلق احساس نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتے اور عذاب یا ثواب ان پر ہو رہا ہوتا تو اس طویل مدت کو بھول نہ جاتے لیکن قرآن میں یہ بھی تو فرمایا گیا ہے، کہ حشر کے دن لوگ اپنے قیام زمین کی مدت کا اندازہ ایک دن یا زیادہ سے زیادہ دس دن لگائیں گے۔ پھر کیا بالکل اسی طرح اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ دنیا کی زندگی میں بھی انسان غفلت و بے خبری اور "مطلق عالم ممات" میں پڑا رہا؟ سوال یہ ہے کہ آخر اس قسم کی قیاس آرائیاں کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ جو نتیجہ آپ نکال رہے ہیں وہ قرآن میں مذکور نہیں۔ قرآن میں صرف ایک واقعہ کے طور پر یہ بیان ہوا ہے کہ قیامت کے روز جب دوبارہ اجساد میں جان ڈالی جائے گی اور لوگ نشأۃ آخرت میں داخل ہوں گے تو ان کو ایسا اور ایسا محسوس ہوگا۔ یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس سے پہلے برزخ میں وہ بے ہوش، بے حس، اور "مطلق عالم ممات" میں ہو گئے۔ اس واقعہ پر محض آپ کا اپنا قیاس ہے۔ اور اس قیاس کو آپ اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ قرآن کی ان صریح آیات کو جن میں اہل برزخ کی سماعت، گویائی، اور ان کی راحت یا تکلیف کا ذکر کیا گیا ہے ان کے صاف مفہوم سے پھیر کر اس قیاس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا قرآن کو قرآن سے سمجھنے کا یہی طریقہ ہے؟ اگر آپ کو قیاس ہی کرنا تھا تو آپ نے یہ قیاس کیوں نہ کیا کہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں پہنچنے کے بعد انسان پہلے عالم کو فراموش کر جاتا ہے، یا اس کو پہلے عالم کا محض ایک موہوم سا خیال رہتا ہے، یا پہلے عالم میں اپنی حالت کے متعلق اس کا اندازہ غلط ہوتا ہے جیسا کہ کذٰلک

كَانُوْا يُوْ عَدُوْنَ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں آپ کے قیاس کی نسبت یہ قیاس قرآن مجید کے ارشادات سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

مولانا کا آخری نظریہ ان آیات پر مبنی ہے جن میں صرف دنیا اور آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر ہے، اور برزخ کا ذکر نہیں ہے، اور جن میں صرف دار آخرت کو دار الجزا فرمایا گیا ہے۔ اس سے مولانا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دنیوی زندگی کے بعد اور قیامت سے پہلے کوئی عذاب و ثواب نہیں ہے لیکن یہ نظریہ متعدد وجوہ سے باطل ہے۔

(۱) ان آیات میں کہیں برزخ کی روحانی زندگی اور اس کے عذاب و ثواب کی نفی نہیں کی گئی ہے بلکہ ان میں دنیا و آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر اسی طرح ایک واقعہ کے طور پر کیا گیا ہے جس طرح بعض دوسری آیات میں برزخ کی زندگی اور اس کے عذاب و ثواب کا ذکر بطور واقعہ آیا ہے۔ پھر پہلی قسم کی آیات دوسری قسم کی آیات کے لئے ناقض کیونکر ہو سکتی ہیں؟

۲۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ دار الجزا اور یوم الفصل دراصل دار آخرت ہی ہے لیکن قرآن مجید کی متعدد آیات سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ برزخ میں انسان کو ایک طرح کی روحانی زندگی حاصل ہو گی جس میں شعور و احساس پایا جائیگا ایسی صورت میں یہ ناگزیر ہے کہ فیصلہ کے دن تک انتظار کرنے کے لیے نفوس انسانی جہاں رکھے جائیں گے وہاں نفوس زکیہ کے لئے راحت اور نفوس خبیثہ کے لئے اذیت ہو۔ اگرچہ ان کے اعمال کی پوری پوری جزا و سزا ان کو فیصلے کے دن ہی ملے گی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انتظار کی مدت میں دونوں قسم کے نفوس ایک ہی حال میں رکھے جائیں۔

۳۔ آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ شہدا کو مرنے کے بعد ہی ثواب ملنا شروع ہو جائے گا۔ اب فرمائیے کہ یہ ثواب یوم الفصل سے پہلے ہے یا اس کے بعد؟ اگر بعد ہے تو کیا شہدا کی قیامت عام لوگوں کی قیامت سے پہلے قائم ہو جائیگی اور اگر یہ ثواب یوم الفصل سے پہلے اور دنیوی زندگی ختم ہونے کے بعد ہے تو آپ کا نظریہ ٹوٹ گیا کیونکہ اس سے ثابت ہو گیا کہ انتظار کی مدت میں نفوس کو رزق عطا ہونا قرآن مجید کے اس ارشاد کے خلاف نہیں ہے کہ اصلی جزا و سزا کا دن قیامت کا دن ہے

حاملانِ قرآن

حضرت قطب عمادی

از

جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی ایس سی (علیگ)

تا ز ہر بادے نجنبی پا بدامن کش چو قطب

کادمی مشت غبار و دہر بادِ صرصر است

حضرت شیخ عماد رضی اللہ عنہ کے خیر الخلف اور علمائے آل عماد کے نعم السلف تھے خلافت نبوی پر اپنے والد کی وساطت سے فائز ہوئے تیمناً حضرت قطب بینادل سے بھی خلافت حاصل تھی علوم کی تکمیل اپنے والد ہی سے فرمائی حقائق کلام اللہ و تدبر فی آیات اللہ میں اس قدر انہماک تھا اور حلقہ درس میں ایسے ایسے اسرار و معارف آپ پر منکشف ہوتے تھے کہ لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ، اسی لیے علماء کاملین آپ کو حبر الامۃ اور ابن عباس ثانی کہتے تھے۔

حطام دنیا سے سخت کارہ تھے' ایک مرتبہ سلطنت نے خدمت صدارت کے لئے آپ کو دار السلطنت میں بلایا' فرمان طلب پر آپ نے یہ فقرہ لکھکر واپس فرمایا کہ "القطب لن یتحرک من مکانہ" (قطب از جانمی جنبد) بطور مثل سائر یہ فقرہ زبانوں پر دائر ہے۔

کلام اللہ کے متعلق آپ کے امالی کے بعض حقائق پیشکش ہیں۔

قرینہ کی بحث | حضرت بن یامین کی جانب انتساب سرقہ کی ذیل میں قرینہ کی بحث تھی کہ "واسئل القریہ"

کہنا اور "واسئل اھل القریہ" مراد لینا کیا لطف رکھتا ہے اور اس میں کیا خاص بلاغت ہے؟

فرمایا پوری آیت یوں ہے:۔

اِرْجِعُوْا اِلٰی اَبِیْکُمْ فَقُوْلُوْا یٰاَبَانَا اِنَّ	یوسف کے بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائیوں سے کہا کہ
ابْنَکَ سَرَقَ وَمَا شَہِدْنَا اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا	والد کے پاس لوٹ جاؤ اور کہو کہ ابا جان آپکے صاحبزادے نے
وَمَا کُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ، وَاسْئَلِ الْقَرْیَۃَ	چوری کی ہم نے وہی کہا جس کا ہمیں علم ہوا غیب کے حافظ
الَّتِیْ کُنَّا فِیْہَا وَالْعِیْرَ الَّتِیْ اَقْبَلْنَا	ہم نہ تھے اس قریہ سے پوچھیے جس میں ہم تھے اس قافلہ
فِیْہَا وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ۔	سے پوچھیے جس کے ساتھ ہم آئے کہ حقیقت میں ہم سچے ہیں۔

فرمایا:۔ آجکل قریہ گاؤں کو کہتے ہیں کہ درجہ میں شہر سے فروتر ہوتا ہے، لیکن برادران یوسف علیہم السلام تو مصر کے دارالملک میں فروکش ہوئے تھے اور وہیں ان کا قافلہ بھی ٹھیرا تھا، پھر اس کو گاؤں (قریہ) کہنا کیونکر درست ہوسکتا ہے؟

تحقیق معنے اصل یہ ہے کہ قدیم عربی زبان میں قریہ کے معنی آبادی کے تھے، ان میں مقام و منزل کی اہمیت نہ تھی، مقیم و نزیل ہی سے ان کو سروکار تھا۔

ومن مذھبی حب الدیار لاھلھا

(میرا مذہب یہ ہے کہ گھروں کی محبت گھر والوں کی باعث ہے)

وللناس فیما یعشقون مذاھب

(دوسرے لوگوں کے طور و طریق اس باب میں جدا جدا ہیں)

بحرین کے عمالقہ نے جنھیں آجکل فینیقی کہتے ہیں اندلس کے ساحل پر ایک شہر آباد کیا تھا اور اس کا نام "القریہ" رکھا تھا، اگر قریہ گاؤں ہوتا تو یہ شہر کا نام نہ پڑتا، قریہ سے صرف انسانی آبادی مراد ہے اور بس

اعجاز مقال ایک بات اور بھی ہے ابوبکر بن الانباری کہتے ہیں:۔

اسئال القرية والعير والجدار و الحيطان فانها تجيبك وتذكر لك صحة ما ذكرناه لانك من اكابر انبياء الله فلا يبعد ان ينطق الله هذه الجمادات معجزة لك حتى تخبر بصحة ما ذكرناه

قریہ سے پوچھو، قافلہ سے پوچھو، دیوار سے پوچھو، احاطے سے پوچھو، یہ سب جواب دیں گے، اور ہمارے بیان کی صحت پر صاد کریں گے۔ آپ بڑے پیغمبروں میں ہیں، کیا دور ہے کہ بطور معجزہ کے اللہ تعالیٰ ان جمادات کو گویا کر دے کہ تمام بیان کی درستی پر ناطق ہوں۔

زبان حال: ابن الانباری کا بیان، دلیل معجزہ ہو یا دلیل عجز، ان بیہودہ قدرت کی ضرورت نہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ اسلوب عرب سے آگاہی ہو۔ کہتے ہیں۔

سل الارض فقل من حفر انهارك وغرس اشجارك وجنى ثمارك فان لم تجبك حوارا اجابتك اعتبارا

زمین سے پوچھو کہ تیری نہریں کس نے جاری کیں، درخت کس نے لگائے، پھل کس نے چنے، اگر اس نے زبان قال سے اس کا جواب نہ دیا تو زبان حال سے ضرور اس کا جواب دیگی۔

عرب منازل محبوب سے مخاطب ہوتے ہیں، ٹوٹے پھوٹے گھروں سے خطاب کرتے ہیں:

يا دار عبلة بالجواء تكلمي وعمي صباحا دار عبلة واسلمي

(اے عبلہ (محبوبہ) کے گھر کہ مقام جواء میں ہے مجھ سے باتیں کر) (اے عبلہ کے گھر میں تجھے صبح بخیر کہتا ہوں اور سلام کرتا ہوں)

والدار لو نطقتنا ذات اخبار

(گھر اگر ہم سے باتیں کرنا چاہے تو اس کے پاس بہتیری خبریں ہیں)

آسمان و زمین کی باتیں: توضیح مزید کے لیے اس مقدمہ کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ مدار اسلوب عرب اس پر ہے:

ان الشيء اذا ظهر ظهورا تاما كاملا فقد يقال فيه سل السماء والارض و جميع الاشياء عنه والمراد انه بلغ

جب کوئی چیز پوری طرح اور مکمل طور پر نمایاں ہو چکی ہو تو بعض اوقات اس صورت میں کہتے ہیں آسمان سے پوچھو زمین سے پوچھو اور تمام چیزوں سے اس باب میں پوچھ دیکھو

فی الظهور الی الغایۃ التی ما بقی للشك فیہ مجال۔
مراد یہ ہوتی ہے کہ ظہور و نمود میں یہ بات اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اب اس میں شک و شبہ کی مجال ہی نہیں۔

دخول نار | گفتگو یہ تھی کہ خلق سموات و ارض و اختلاف لیل و نہار میں اولی الالباب جب اللہ کی نشانیاں مشاہدہ کرتے ہیں تو ہر حال میں اللہ کی یاد اور اس کی مخلوقات میں تفکر کرنے سے ان کو ماننا پڑتا ہے کہ یہ تمام کارخانہ آفرینش باطل اور رائیگاں نہیں، اس تیقن کے بعد قلب سلیم اسی رؤف و رحیم کی جانب رجوع کرتا ہے عذاب نار سے پناہ مانگتا ہے، اور رسوائی سے بچنے کی دعا کرتا ہے کہ :۔

رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ۔
اے ہمارے پروردگار حقیقت میں تو نے جسے آگ میں ڈالا اس کو رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

محل اشکال | آیت میں محل اشکال یہ محسوس ہو رہا تھا کہ دخول نار جب موجب رسوائی ہے تو اللہ کا کام ہے کہ مومنین کو اس سے محفوظ رکھے قیامت میں کوئی مومن ایک لمحہ کے لئے بھی دوزخ میں نہ جائے اور کسی پر آنچ تک نہ آنے پائے وہ خود کہہ چکا ہے کہ :۔

يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ
روز قیامت وہ دن ہوگا جس دن اللہ تعالی اپنے پیغمبر کو رسوا ہونے دیگا اور نہ ان مومنین کو جو آپ کے ساتھ ایمان لائے۔

احقاق حق | فرمایا :۔

إن قوله يوم لا يخزي الله النبي والذين آمنوا معه انما يقتضي ان لا يحصل الاخزاء حال ما يكونوا مع النبي صلى الله عليه وسلم۔
اللہ تعالی کا یہ فرمانا کہ قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مومنین صحابہ کو اللہ رسوا نہ کریگا" اس کے محض اسی قدر معنی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور صحبت کی برکت سے مومنین بھی رسوائی سے محفوظ رہیں گے۔

وهذا النفي لا ينافي اثبات الاخزاء في الجملة
یعنی دوسری صورتوں میں اثبات اخزاء کے منافی نہیں۔

یعنی جن مومنین کو صحبت نبوی کی سعادت حاصل نہیں اور بقدر خطایا و ذنوب کچھ مدت کے لیے وہ معذب بالنار ہوں تو اس آیت سے کیا تناقض ہوا جس میں آنحضرت اور آپ کے صحابہ مومنین سے خزی و رسوائی کی نفی ہے اور اس کی اسی حد تک تخصیص و تحدید کر دی ہے۔

مناد برحق | عرض کی اسی کے ساتھ یہ آیت ہے:۔

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۔

اے ہمارے پروردگار حقیقت میں ہم نے ایک ندا لگانے والے کو سنا کہ وہ ایمان کی آواز دے رہا تھا کہ تم سب اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، اسی آواز پر ہم ایمان لائے لہذا اے پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے ہماری بدکاریوں کو ہم سے مٹا دے، اور نیک آدمیوں کے ساتھ ہمیں موت نصیب کر۔

یہاں ندا لگانے والے سے اکثر مفسرین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لیتے ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟۔

قرآن کی آواز | فرمایا۔

المنادی ھو القران لانہ لیس کل احد لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اما القران فکل احد سمعہ و فھمہ

منادی یعنے ندا لگانے والے سے مراد قرآن ہے، ہر شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کہاں سنی قرآن کی آواز تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد بھی سب نے سنی اور سب اس کا مطلب سمجھے۔

مجاز متعارف | و ھذا و ان کان مجاز الا انہ مجاز متعارف لان القران لما کان مشتملا علی الرشد و کان کل من تاملہ وصل

یہ معنی اگرچہ مجازی ہیں تاہم یہ مجاز متعارف ہے، قرآن تمام تر رشد و ہدایت ہے جس نے اس میں فکر کی اور توفیق الہی رفیق ہوئی تو اس کو ہدایت حاصل ہوگئی اس بنا پر

الی الھدیٰ اذ اوفقہ اللہ تعالیٰ لذالک فصار کانہ یدعوا الی نفسہ وینادی بما فیہِ مِنْ اَنواع الدلائل کما قیل فی جہنّم تدعو من ادبر و تولّی اذ کان مصیرھم الیھا۔

گویا قرآن زبان حال سے خود اپنی جانب لوگوں کو بلاتا ہے اور اپنے گوناگوں دلائل کا خود ہی نعرہ لگاتا ہے کلام اللہ ہی میں جہنم کے متعلق ہے کہ تدعو من ادبر و تولّی یعنی جو پیچھے ہٹا اور جس نے منہ موڑا دوزخ ایسے لوگوں کو بلا لیگی کیونکہ ان دوزخیوں کی بازگشت دوزخ ہی تو ہے۔

زمانے کی صدا | اوا لعرب تصف الدھر بانہ ینادی و یعظ و مرادھم منھا دلالۃ تصاریف الزمان۔

عربوں کا دستور ہے کہ زمانہ کی صفت میں ظاہر کرتے ہیں کہ زمانہ آواز دیتا ہے اور نصیحت کرتا ہے جس سے مراد گردش زمانہ کی نشانیاں ہیں۔

قالوا :-

ایک عرب شاعر نے کہا ہے :-

یا واضع المیت فی قبرہٖ

(اے مردے کی لاش کو اس کی قبر میں اتارنے والے)

خاطبکَ الدھرُ فلم تسمع

(تجھ سے زمانہ مخاطب ہوا، باتیں کیں، مگر تونے سنی ہی نہیں)۔

غرض کی اس کے بعد یہ آیت ہے :-

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَاد۔

اے ہمارے پروردگار ہمیں وہ عطا فرما جس کا اپنے پیغمبروں کی زبان سے تونے وعدہ کیا تھا اور قیامت کے دن ہم کو رسوا نہ کر حقیقت میں تو وعدہ خلاف نہیں۔

اس میں کئی باتیں محل تامل ہیں۔

(۱) جب وہ جانتے تھے کہ اللہ وعدہ کرچکا ہے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اللہ وعدہ خلاف نہیں تو

وفائے وعدہ کے لیے دعا کی کیا حاجت تھی؟

۲- حصول ثواب مزیل عذاب ہے، یہ کہنا کہ "اپنے پیغمبروں کی زبان سے تو نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر" طلب ثواب ہے، اور یہ عرض کرنا کہ "قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کر" طلب ترک عذاب ہے، طلب ثواب میں ترک عذاب خود ہی آگیا تحصیل حاصل کے لیے اعلام معلوم سے کیا فائدہ؟

درخواست کا مطلب | فرمایا۔

المقصود من هذه الآية طلب التوفيق	اس آیت سے مقصود یہ ہے۔
للطاعة والعصمة عن المعصية۔	(۱) عبادت کے لیے طلب توفیق
	(۲) معصیت سے بچنے کے لیے طلب عصمت۔
فقوله وآتنا ما وعدتنا معناه وفقنا	"ہمیں وہ دے جس کا تو نے وعدہ کیا تھا" اس کے
للاعمال التي بها نصير اهلا لوعدك	معنی ہیں کہ ہمیں ایسے اعمال کی توفیق عطا فرما جن کی بنا پر
واعصمنا من الاعمال التي نصير بها	ہم میں تیرے وعدے کی اہلیت آجائے۔
اهلا للعقاب والخزي	اور ہمیں ایسے اعمال سے بچا جن کی بنا پر ہم عذاب اور رسوائی کے مستحق ہوں
توفیق طاعت و استقامت | کانه قیل وفقنا	گویا یہ گذارش تھی کہ یا اللہ ہمیں اپنی عبادت کی توفیق
لطاعتك فانا لا نقدر على شيء من	دے، بدون تیری توفیق کے ہم سے کچھ عبادت نہیں ہوسکتی
الطاعات الا بتوفيقك واذا وفقت	اور یا اللہ جب ہمیں اپنی عبادت کی توفیق دے تو
لفعلها فوفقنا لاستبقائها فانا	استقامت کی توفیق بھی دے، بدون تیری توفیق کے نہ ہم
لا نقدر على استبقائها واستدامتها	استقامت پر قادر ہیں نہ استدامت پر قدرت
الا بتوفيقك۔	رکھتے ہیں۔
عذاب عظیم | وقوله ولا تخزنا يوم القيمة	"ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا" یہ ویسا ہی ہے جیسے اللہ

شبيهٌ بقولهٖ و بدالهم من الله مالم
يكونوا يحتسبون" فانه ربما ظن الانسان
انه على الاعتقاد الحق و العمل الصالح
ثم انهٗ يوم القيمة يظهر له ان اعتقاده
كان ضلالًا و عمله كان ذنبًا فهناك
تحصل الخجالة العظيمة والحسرة
الكاملة والاسف الشديد۔
عذاب روحانی | وذلك هو العذاب الروحانی
وهذا العذاب اشد من العذاب الجسمانی
لانهم طلبوا فی هذا الدعاء اشياء
فاول مطالبهم الاحتراز عن العذاب
الجسمانی وهو قوله قنا عذاب النار
و آخرها الاحتراز عن العذاب
الروحانی وهو قوله ولا تخزنا يوم القيمة
فثبت بذلك ان العذاب
الروحانی اشد من العذاب الجسمانی

کی جانب سے اُن پر وہ کچھ نمایاں ہوا جس کا انھیں گمان
تک نہ تھا"۔
بعض اوقات انسان اپنے آپ کو صحیح الاعتقاد و
صالح العمل سمجھتا ہے، بعد کو قیامت کے دن ظاہر ہوتا
ہے کہ اس کا اعتقاد گمراہی اور اُس کا عمل گناہ
تھا، اس وقت اُس کو بڑی خجالت، نہایت حسرت
اور سخت افسوس لاحق ہوتا ہے۔
یہی روحانی عذاب ہے۔
یہ روحانی عذاب جسمانی عذاب سے کہیں زیادہ سخت ہے۔
اس دعا میں کئی چیزوں کی درخواست تھی۔
پہلی درخواست عذاب جسمانی سے بچنے کی تھی یعنی
"قِنا عذاب النار" ہمیں آتش دوزخ سے بچا۔
آخری درخواست عذاب روحانی سے بچانے کی تھی
یعنی "ولا تخزنا یوم القیمۃ" ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر،
اس رسوائی کا عذاب روحانی عذاب ہے۔
اس سے یہ ثابت ہوا کہ جسمانی عذاب کے مقابلہ میں روحانی عذاب سخت ہے

رسائل و مسائل

تعلیمات قرآن کے متعلق بحث

(۳)

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز۔ بی۔ اے

آدم کا گناہ | اس باب میں میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ میں اور صاحب تعلیمات میں یونہی لفظی سی نزاع باقی رہ گئی ہے یعنی وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ حضرت آدم اپنے گناہ کی پاداش میں جنت سے نکالے گئے، لہذا جب گناہ کی سزا مل جائے اس کی معافی کیا ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں کہ جنت سے تو وہ ضرور نکالے گئے لیکن یہ اس گناہ کی پاداش میں نہ تھا، بلکہ گناہ کے طبعی اثر کی بنا پر تھا۔

آپ پہلے توبہ اور عفو کے الفاظ کو لیجیے۔ توبہ کے لغوی معنی رجوع کے ہیں۔ یعنی جدھر سے منہ موڑ لیا تھا اس کی طرف پھر رُخ کیا جائے۔ اور جب اسکی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے اور صلہ علیٰ آتا ہے تو اس کے معنی توبہ قبول کرنے، یعنی اپنے فضل و احسان کے ساتھ پھر اس بندے کی طرف رجوع کرنے کے ہیں۔ گویا جس کی توبہ قبول ہوئی، وہ راندۂ درگاہ نہ ہوا، بلکہ اس کی رحمتوں نے پھر اسکی طرف رجوع کر لیا۔ اور عفو کے معنی ہیں القصد لتناول الشئ (مفردات راغب) اور قرآن کریم میں جہاں بھی عفو استعمال ہوا ہے اس کے معنی ایسی معافی کے ہیں جس کے بعد کچھ باقی نہ رہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ آیت (۲۳۷) میں دیکھیے ایسی عورتیں جنھیں بلا تمسک طلاق دیدی جائے انکا نصف مہر واجب آتا ہے۔ مگر۔

اِلَّآ اَنۡ یَّعۡفُوۡنَ اَوۡ یَعۡفُوَا الَّذِیۡ بِیَدِهٖ — یہ کہ وہ خود معاف کر دیں یا وہ معاف کر دے

عقدۃ النکاح (۲ : ۳۱) جس کے ہاتھ میں عقدۂ نکاح ہو۔

اس قسم کی اور بہت سی آیات ہیں اسی بنا پر گناہ کے اثر کے ازالہ کو عفو گناہ کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ان دونوں کے معانی مختلف ہیں اور جو آیت آپ نے پیش کی ہے وہی اس پر دلالت کر رہی ہے آپ نے فرمایا کہ فتاب علیکم وعفا عنکم۔ میں عفا عنکم، تاب علیکم کی تفسیر کر رہا ہے۔ اس سے خود ثبوت ملتا ہے کہ توبہ اور عفو دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اب اسی اصول پر حضرت آدم کے متعلق جو وارد ہوا ہے فتاب علیہ وہدیٰ، تو اس میں توبہ کی تفسیر ہدیٰ کیوں نہ قرار دی جائے۔ اللہ نے ان کی توبہ قبول کی یعنی ہدایت فرمائی یعنی اللہ نے ان کے گناہ پر شیطان کی طرح انہیں ملعون نہیں کیا بلکہ ان کو پھر شرف و اجتباء عطا فرمایا یا ان کو استغفار کی توفیق دی۔ ان کی طرف رجوع فرمایا اور جنت میں آنے کا راستہ بتایا (وہدیٰ کہ ایمان و عمل صالح کی راہ سے جنت میں آجاؤ۔ اور یہی کچھ تعلیمات قرآن میں ہے۔ قبول توبہ کی ایسی صورت جس میں جرم سزا سے نہ بچے، صاحب تعلیمات کے نزدیک معافی نہیں، خواہ وہ طبعی اثر سے ہو یا کسی اور اثر سے۔

اب قرآن کریم میں دیکھیے تو کچھ ایسی ہی نہج کے اشارے ملتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں قصہ آدم میں یوں مذکور ہے

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۔ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۔

شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی وجہ سے لغزش دیدی سو ان کو اس میں سے نکال کر رہا جس میں وہ دونوں تھے۔ اور ہم نے کہا کہ نیچے اترو۔ تم میں سے بعض بعضوں کے دشمن رہیں گے۔ اور تم کو زمین میں چندے ٹھیرنا اور فائدہ حاصل کرنا ہے۔ ایک میعاد معین تک۔

یہاں ہبوط آدم کا حکم موجود ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمہیں دنیا میں ٹھیرنا اور کام چلانا ہے لیکن اس سے زیادہ کوئی ہدایت وارشاد نہیں، کہ اس وقت تک رحمت الٰہی نے رجوع نہیں کیا۔ اس کے آگے دیکھیے

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ ۔ فَتَابَ عَلَيْهِ ۔

ازاں بعد آدم نے اپنے رب سے چند الفاظ حاصل کیے تو

إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۔ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۔ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔

اللہ نے انکی طرف توجہ فرمائی ۔ بیشک وہی بڑا توبہ قبول کرنے والا ، مہربان ہے ہم نے کہا کہ اترو اس سے سب کے سب پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت آئے ، سو جو شخص میری اس ہدایت کی پیروی کریگا تو نہ ایسے لوگوں کو کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ہی ایسے لوگ غمگین ہوں گے ۔

یہاں آدم نے توبہ کی ۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی ۔ اور ان سے ہدایت کا وعدہ کیا جو تو اس سے پہلے نہیں کیا گیا تھا ۔ یہ وہی تفصیل ہے جو فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ میں مجمل تھی ۔ ان کی توبہ قبول کی یعنی ہدایت عطا کی

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے توبہ قبول کرنے (یعنی بندے کی طرف رجوع کرنے) کی دو شکلیں ہیں ۔ ایک تو یہ کہ توبہ قبول کرنے کے بعد وہ راستہ بتا دیا جس پر عمل پیرا ہونے سے گناہ کے اثرات زائل ہو جائیں جیسا کہ حضرت آدم کے لئے فتاب علیہ وھدی میں ہے ۔ دوسرے یہ کہ توبہ قبول کی اور گناہوں کے اثرات میں سے کچھ بھی باقی نہ رکھا سب محو کر دیے جیسا تاب علیکم وعفا عنکم میں ہے ۔ یہی سورہ شوریٰ کی اس آیت میں ہے

هُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّئَاتِ (۴۲ : ۳) ۔

اللہ وہ ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو معاف کر دیتا ہے ۔

آپ فرماتے ہیں کہ سزا مل جانے کے بعد شرفِ اجتبا باقی نہیں رہتا۔[1] تو کیا وہ لوگ جن سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جس کی فوری پاداش اسی دنیا میں مل جاتی ہو ، اگر اس پاداش کے بعد توبہ کر لیں ، اور ان کی توبہ قبول ہو جائے ، تو آپ کے نزدیک کیا وہ ہمیشہ کے لیے شرفِ اجتباء سے محروم کر دیے جائیں گے ؟ توبہ قبول ہونے کے معنی ہی یہی ہیں کہ شرفِ اجتباء ، اور توجہاتِ رحمانی سے محروم نہ رکھے جائیں ، لہذا اگر حضرت آدم کی توبہ ، بعد پاداش بھی تسلیم کر لی جائے تو یہ خدشہ باقی نہیں رہتا ۔

---

[1] میں نے یہ کہیں نہیں کہا ۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ گناہ کو معاف نہ کرنا اور اس پر سزا دینا ، پھر اسی سزا کی حالت میں شرفِ اجتباء عطا کرنا ، دونوں بالکل متضاد باتیں ہیں ۔ مدیر ترجمان القرآن

اس کے بعد آپ نے سزا و گناہ کے فلسفہ پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ موضوع بڑا اہم اور مستقل ہے اور افسوس ہے کہ ضمناً میں بھی اس پر شرح و بسط سے کچھ نہیں لکھ سکتا لیکن آپ نے جو طبعی اور غیر طبعی اثرات میں فرق کیا ہے۔ میں اسے نہیں سمجھ سکا۔

آپ نے فرمایا ہے کہ ہبوط کا حکم "سزا اور انتقام کے طور پر نہ تھا، بلکہ اس شجر کا مزہ چکھنے کا طبعی نتیجہ تھا"۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ گناہوں کی "انتقامی" سزا کے قائل ہیں لیکن میں تو قرآن کریم سے کوئی اشارہ نہیں پاتا جس میں یہ ہو کہ گناہوں کی سزا بطور انتقام دیجائے گی۔ انسان اگر گناہ کرتا ہے تو اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تو اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ لہذا انتقام کیسا؟ اللہ تعالیٰ کا انتقام اس مفہوم میں کبھی نہیں ہوتا جیسا آپ نے فرمایا ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ یہ ہبوط اس شجر کا مزہ چکھنے کا طبعی نتیجہ تھا۔ کیا اللہ تعالیٰ کے یہاں سزا غیر طبعی بھی ہوتی ہے؟ خیال فرمائیے کہ اگر حضرت آدمؑ کے گناہ کا طبعی اثر بعد عفو گناہ بھی اس امر سے مانع تھا کہ وہ جنت میں رہ سکیں، تو دنیا میں اگر ایک شخص ایک گناہ کے بعد تائب ہو جائے۔ اور اسے اس گناہ سے معافی بھی مل جائے۔ تو آپ کے خیال کے مطابق اس گناہ کا طبعی اثر تو باقی رہے گا جو ہو سکتا ہے کہ اسے جنت میں داخل ہونے سے روک دے۔ اور اگر کہا جائے کہ جنت میں داخلے کے وقت ایسے طبعی اثرات (مثل احساس زوجی وغیرہ) مٹا دیے جائیں گے، تو جب حضرت آدم کا گناہ معاف کیا گیا تھا تو اس گناہ کے طبعی اثرات مٹا دینا کونسا مشکل کام تھا حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا نظام جسمانی پر طبعی اثر (جیسا آپ نے شراب کے نشہ والی مثال میں بیان فرمایا ہے) تو فی نفسہ کوئی شے نہیں۔ ایک چور کا ہاتھ شرعی عدالت کے حکم سے کاٹ دیا جائے اور ایک مرد مجاہد کا بازو میدان جنگ میں شہید ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ نظام جسمانی پر طبعی اثرات یکساں ہیں حقیقت میں کس قدر فرق ہے۔ خدا کے حضور تو اس قسم کے طبعی اثرات کا کچھ وزن نہیں۔ اور جب گناہ معاف کر دیا جاتا ہے تو ایسے اثرات جنکی فی الواقع کوئی حقیقت ہوتی ہے

مٹا دیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ (۴۲: ۴) جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے وہ تمہارے اعمال کی وجہ سے ہے اور اکثر قصوروں کو اللہ معاف کر دیتا ہے۔

یعنے جو گناہ معاف نہیں کیے جاتے اور اُن کی سزا دنیا میں ملجانی ہوتی ہے، ان کی وجہ سے انسان مصائب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جن گناہوں کی معافی مل جاتی ہے ان کے نتائج بھی انسان کے سامنے نہیں آتے تو ظاہر ہے کہ اگر معافی میں محض خدا کی ناراضگی کی معافی ہی ہوتی تو مصائب جو لامحالہ کسی طبعی شکل ہی میں آتے ہیں کس طرح سے ٹل جاتے؟ لہٰذا معافی میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اعمال کے ایسے طبعی اثرات جن کا خدا کے نزدیک کچھ وزن ہو دونوں زائل ہو جاتے ہیں

ان تصریحات سے تو صاحب تعلیمات کا خیال ہی مرجح نظر آتا ہے۔

غلامی بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اسیران جنگ کو یا تو احساناً رہا کر دیا جائے۔ یا فدیہ (بشکل زر نقد یا مبادلہ اسیران جنگ) لیکر۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ احساناً چھوڑنا خلاف مصلحت ہو اور فدیہ ادا کرنے پر دشمن تیار نہ ہوں، تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ صاحب تعلیمات نے لکھا ہے کہ ایسی صورت میں وہ شاہی قیدی ہوں گے۔ اور ان سے ایسا ہی سلوک کیا جائے گا لیکن آپنے فرمایا ہے کہ ایسی شکل میں وہ غلام بنا لیے جائیں گے۔ صاحب تعلیمات نے آپکے اس دعوے کی دلیل میں قرآن کریم سے ثبوت مانگا تھا۔ سو آپنے اپنے جواب میں اس طرف توجہ منعطف نہیں فرمائی۔ اور قرآن کریم سے اسیران جنگ کو غلام بنانے کے جواز میں ثبوت پیش نہیں کیا۔ البتہ دو دلیلیں پیش کی ہیں۔ اول تو یہ کہ جب دشمن مسلمان اسیران جنگ کو غلام بنا کر رکھیں تو مسلمان ان کے قیدیوں کو کیوں نہ غلام بنائیں۔ بات تو ہے یہ جی لگتی ہوئی لیکن اس کا کیا علاج کہ قرآن کریم مسلمانوں کو اس سطح سے بہت بلند لے جانا چاہتا ہے کہ اگر دشمن تمہارے ساتھ نازیبا سلوک کریں تو تم بھی ایسا ہی ناشایستہ سلوک ان سے کرو۔ مسلمانوں کو تو یہ بھی اجازت نہیں دیگئی کہ مشرکین کی مٹی کی مورتیوں کو بھی گالی دیں۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ ان غلاموں

سے انتہائی رافت ورحمت کے سلوک کا حکم دیا گیا ہے یہ بات از خود آپکے قائم کردہ اصول کے خلاف ہے۔ کفار تو آپکے قیدیوں سے انتہائی بدسلوکی کا برتاؤ کریں اور آپ انہیں اپنی سوسائٹی کے بہترین افراد میں جگہ دیں۔ پھر اگر آپکا اصول مان لیا جائے تو کیا آپ اس کی بھی اجازت دیں گے کہ دشمن اگر مسلمان قیدی عورتوں سے کوئی گستاخی کریں، تو اس کے بدلے میں مسلمان بھی ان کی قیدی عورتوں سے ایسا ہی سلوک کریں؟ اسلام کے اصول تو بالکل "اپنے ہیں" اور یہ انھیں کے ماتحت حکم دیگا۔ دنیا خواہ کچھ کرے۔

دوسری دلیل پھر اصحاب رسول اللہ اور اہل بیت کے طرز عمل کی پیش کی ہے۔ میرے لیے تو یہ کافی ہوسکتی ہے لیکن معترض اگر کہیں کہ آپ تو وعدہ کرچکے ہیں کہ قرآن سے باہر نہیں جاؤں گا پھر اسی سے ثبوت کیوں نہیں دیا جاتا، تو کیا حق بجانب نہیں ہوگا؟

آپ نے فرمایا ہے کہ احساناً قیدیوں کو چھوڑ دینے میں مسلمانوں کو بہت نقصان رہتا ہے کہ اس صورت میں کوئی قوم اتنی احمق نہ تھی کہ زرفدیہ ادا کرتی لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ بطور احسان چھوڑ دینے میں جو فائدے حاصل ہوئے زرفدیہ کے درہم ودینار انکا کم ہی مقابلہ کرسکتے ہیں۔ اس سے اسلام کے متعلق لوگوں کی ذہنیت بدل گئی۔ آنحضرت نے ہزارہا قیدی بلافدیہ لیے رہا کردیے اور ان احسانات کا جو اثر ہوا اس کے شاہد زمین وآسمان ہیں۔ پھر سوال تو غلام بنانے اور انھیں فروخت کرنے کا ہے اس کے متعلق فرمائیے کہ قرآن کا کیا حکم ہے؟ اور آج اگر کوئی قوم فدیہ نہ ادا کرے، اور مسلمان ان کے اسیران جنگ کو احساناً نہ چھوڑنا چاہیں تو ان سے کیا سلوک کریں؟ مَا ملکت ایمانکم اور اسیران جنگ کی بحث آج بڑے اہم مسائل میں سے ہے۔ اسے ضرور حل کیجیے۔

(باقی)

الجواب

توبہ کا مسئلہ | توبہ کے مسئلہ میں میرے اور صاحب تعلیمات قرآن کے درمیان لفظی سی نزاع نہیں ہے، جیسا کہ آپ نے خیال فرمایا ہے، بلکہ یہ ایک اصولی نزاع ہے۔ صاحب تعلیمات نے لکھا تھا۔

"آدم کے گناہ کو اللہ نے معاف نہیں کیا اور نہ ان کو جنت سے نہ نکالتا۔ صرف ان کی توبہ قبول کی"۔

اس پر مجھے دو حیثیتوں سے سخت اعتراض ہے:۔

اولاً، اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے توبہ قبول ہونے کے بعد بھی گناہ باقی رہتا ہے اور اس کی سزا ملتی ہے۔ یہ بات قرآن کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔

ثانیاً، قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ہم نے آدم کا گناہ معاف نہیں کیا۔ برعکس اس کے وہاں تو یہ ارشاد ہوا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کی توبہ قبول کی اور انہیں ہدایت بخشی۔ یہ محض صاحب تعلیمات کا اپنا قیاس ہے کہ اللہ نے چونکہ حضرت آدم کو جنت سے نکال دیا۔ اور توبہ کے بعد انہیں واپس نہیں کیا، "لہٰذا" (اور یہ وہی "لہٰذا" ہے جس کی خود آپ نے اپنے مضمون ایمان بالرسالت میں مذمت فرمائی ہے) اللہ نے آدم کا گناہ معاف نہیں کیا۔ قرآن مجید میں اس قسم کی قیاس آرائی کو میں اصولاً ناجائز سمجھتا ہوں، اور یہی وہ تفسیر بالرائے ہے جس کو ہمیشہ سے علماء حق ناجائز کہتے آئے ہیں۔

امر اول کے متعلق جو تصریحات قرآنی اس سے پہلے میں اپنے ایک مضمون میں نقل کر چکا ہوں، معلوم ہوتا ہے کہ ان سے آپ کی تشفی نہیں ہوئی، لہٰذا اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کروں گا۔

معنی توبہ | توبہ کے لغوی معنی وہی ہیں جو آپ نے بیان کیے ہیں، یعنی عود اور رجوع۔ اگر یہ بندے

کی طرف سے خدا کی جانب ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ اپنی نافرمانی پر نادم ہوا، اور راز سر نو فرمانبرداری کی طرف پلٹ آیا۔ اور اگر یہ خدا کی جانب سے بندے کے حال پر ہو، تو مطلب یہ ہوگا کہ حضرت حق نے اس کی ندامت اور اس کے رجوع الی الطاعت کو قبول فرمالیا اور اپنی مہربانی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب سوال یہ ہے کہ بندے کی ندامت و رجوع الی الطاعت اور اللہ تعالیٰ کے اس کی جانب مہربانی کے ساتھ متوجہ ہونے کا نتیجہ کیا ہے؟ آیا یہ کہ اس کا گناہ بخش دیا جائے اور جس سزا کا وہ مستحق ہوچکا تھا، اس سے معاف کر دیا جائے؟ یا یہ کہ صرف توبہ قبول کرلی جائے مگر گناہ پھر بھی باقی رہے اور اس کی سزا پھر بھی دیجائے؟ صاحب تعلیمات دوسری صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔ (کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ ۶:۲۰) پہلی صورت کو ترجیح دیتا ہے، اور بار بار یقین دلاتا ہے کہ جب تم گناہ کرکے اس پر شرمسار ہوگے اور نافرمانی کے بعد پھر اطاعت میں داخل ہوگئے تو ہم تمہارے جرم کو مہربانی سے ڈھانک دیں گے (مغفرت) اور اس جرم کے اثر کو مٹادیں گے۔ (عفو)۔

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِہٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوْبُ عَلَیْہِ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵:۶)۔	پس جس نے ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور نیک رویہ اختیار کیا تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔
مَنْ عَمِلَ مِنْکُمْ سُوْٓءًۢا بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِہٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّہٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۶:۶)	جس کسی نے تم میں سے کوئی برا فعل جہالت کی بنا پر کیا، پھر اس کے بعد توبہ کرلی اور نیک رویہ اختیار کرلیا تو یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔
وَ الَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِہَا وَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّکَ مِنْۢ بَعْدِہَا	اور جن لوگوں نے برے اعمال کیے پھر ان کے بعد توبہ کرلی اور ایمان لائے تو ان کے بعد تیرا رب یقیناً بخشنے والا

لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۷: ۱۹) مہربان ہے۔

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی (۲۰: ۴) اور یقیناً میں اس کیلیے بڑا بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور نیک عمل کیا پھر راہ راست اختیار کی۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ (۴۲: ۳) اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (۴۰: ۱) وہ گناہوں کو بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ بندے کی توبہ کا یقینی نتیجہ حق تعالیٰ کی طرف سے قبول توبہ ہے اور قبول توبہ کا یقینی نتیجہ عفو و مغفرت ہے۔ اور کیسے نہ ہو؟ جو خدا اپنے بندوں میں یہ صفت دیکھنا چاہتا ہے کہ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ (۴۲: ۴) اور وَالْكَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (۳: ۱۴) کیا وہ خود اپنے لیے اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ ایک بندہ اپنی فطری کمزوری کی بنا پر گناہ کرنے کے بعد شرمسار رہو اور اس کے آگے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی کا طلبگار ہو، مگر وہ اسے معاف نہ کرے اور سزا دے کر ہی چھوڑے؟ اگر خدا میں یہ صفت ہو تو اس کے سوا پھر کون ہے جس سے انسان مغفرت کی امید کر سکے؟ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (۳: ۱۴)۔

آدم کا گناہ | جب یہ قاعدہ کلیہ قرآن مجید سے معلوم ہو گیا تو آدم علیہ السلام کے متعلق جو یہ فرمایا گیا ہے کہ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۲: ۴)۔ اور ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَهَدٰی (۲۰: ۷) اس کے معنی یہی لینے چاہییں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور ان کے گناہ کو معاف کر دیا۔ محض اس واقعہ پر کہ آدم علیہ السلام جہاں سے نکالے گئے تھے وہاں واپس نہیں کیے گئے، کوئی قیاس قائم کرنا اور قرآن کے بتائے ہوئے

قاعدے کے خلاف اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اللہ نے قبول توبہ کے باوجود حضرت آدم کے گناہ کو معاف نہیں کیا، ایک ناجائز قیاس آرائی ہے۔ حضرت آدم نے صرف ایک حکم کی خلاف ورزی کی تھی، کوئی شرک نہیں کیا تھا کہ وہ معاف نہ ہو سکتا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (۴ : ۱۸) اور بالفرض اگر وہ شرک بھی کرتے، تو اس سے توبہ کر لینے کے بعد وہ اُسی طرح معاف کر دیے جاتے جس طرح عرب کے مشرکین اسلام لانے کے بعد معاف کر دیے گئے۔ لہذا ایک مسلمان پر واجب ہے کہ حضرت آدم کے جنت میں واپس نہ جانے کی کوئی اور وجہ تلاش کرے، اور اگر کوئی وجہ اس کو نہ ملے، یا کسی وجہ پر اس کا اطمینان نہ ہو، تو سکوت اختیار کرے اپنی عقل سے ایسے نتیجے نکالنا جو قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہوں، کسی مومن قانت کا کام نہیں ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن کا غلط طریقہ | یہ بات ایک حد تک قابل مسرت ہے کہ آپ نے صاحب تعلیمات کا قدم بقدم اتباع نہیں کیا، اور قرآن مجید کے بیانات پر اپنے قیاسی "لہذا" کی عمارت نہیں اٹھائی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات قابل افسوس بھی ہے کہ آپ نے قرآن مجید سے استدلال کر کے اس سے وہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے جو خود قرآن ہی کے مقرر کیے ہوئے ایک قاعدۂ کلیہ کے خلاف ہے۔ آپ کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

> "آدم علیہ السلام نے گناہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سزا اس صورت میں دی کہ جنت سے نکال باہر کیا۔ آدم علیہ السلام نے اس پر توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی، مگر گناہ کی وہ سزا بحال رکھی جو ان کو دی گئی تھی، اور گناہ کے اثرات کو زائل نہ کیا، البتہ ان کے لیے قبول توبہ کی یہ شکل اختیار کی کہ انہیں جنت میں واپس آنے کا راستہ بتا دیا۔"

یہ نتیجہ جو آپ نکال رہے ہیں قرآن مجید کی اس تصریح کے خلاف ہے کہ وَ ھُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَ یَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ (۴۲ : ۳) اس آیت میں تصریح ہے کہ قبول توبہ کے بعد گناہوں کے اثرات مٹا دیے جاتے ہیں۔ مگر آپ اس کے برعکس فَتَابَ عَلَیْہِ وَ ھَدٰی

سے یہ معنی نکال رہے ہیں کہ توبہ قبول کرنے کے بعد گناہ کا اثر باقی رہا اور صرف اس شکل میں توبہ قبول کی گئی کہ وہ راستہ بتادیا گیا جس سے گناہ کے اثرات زائل ہوجائیں۔ یہ بات تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول کے خلاف ہے، قرآن سے قرآن کی تفسیر کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک آیت کی ایسی تفسیر کی جائے جو قرآن مجید کی دوسری آیت یا آیات سے مطابقت رکھتی ہو۔

گناہ سزا اور توبہ کی حقیقت | میں نے سزا اور گناہ کے "فلسفہ" پر جو روشنی ڈالی تھی وہ اسی غرض سے تھی وہ میرا اپنا اختراعی فلسفہ نہ تھا، بلکہ قرآن مجید کے ارشادات سے ماخوذ تھا، اگر آپ اس پر غور فرماتے اور اس کو سمجھ لیتے تو حضرت آدم کی توبہ کے مقبول ہونے اور ان کا گناہ معاف ہوجانے، اور اس کے باوجود ان کے جنت سے نکالے جانے کی وجہ آپ کی سمجھ میں آجاتی۔ آئیے، اب قرآن مجید سے اس فلسفے کی تھوڑی سی تشریح سن لیجیے۔

سب سے پہلے یہ قاعدہ ذہن نشین ہوجانا چاہیے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک نظام جسمانی۔ دوسرے عقل جو غور و فکر کرتی اور بھلے بُرے میں تمیز کرتی ہے پہلی چیز پر اللہ تعالیٰ کے قوانین طبیعی (Physical Laws) حکمران ہیں، اور دوسری چیز پر اس کے عقلی احکام و اوامر (Rational Laws) کی حکومت ہے۔ طبیعی قوانین ایک خاص ڈھنگ پر بنائے گئے ہیں اور سارے عالم مادی کی طرح انسان کا جسم بھی ان کے ماتحت ہے اس عالم میں انسان جو حرکت بھی کرے گا، اس کا وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو قوانین طبیعی کے تحت مقرر ہے، اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحت سے کسی خاص موقع پر اس کو بدل دے بخلاف اس کے عالم عقلی میں حرکات کے نتائج اس طور پر مقرر نہیں ہیں جس طور پر عالم طبیعت میں مقرر ہیں۔ یہاں ان کے درمیان اس لحاظ سے تمیز کی جاتی ہے کہ وہ امر الٰہی کے اتباع میں ہیں یا اس کے خلاف! اتباع میں ہیں تو وہ اعمال صالحہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر خوش ہوتا ہے، اور انعام دیتا ہے، خواہ قوانین طبیعی کے ماتحت ان کے نتائج

بالکل مختلف صورت میں ظاہر ہوں۔ اور اگر وہ امر الٰہی کے خلاف ہیں تو وہ گناہ ہیں، اعمال قبیحہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر غضبناک ہوتا ہے، اور سزا دیتا ہے خواہ قوانین طبیعی کی رو سے ان کے نتائج اس دنیا میں خوش گوار ہوں۔ اگر انسان کسی گناہ کے بعد توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دیتا ہے، اس کا غضب فرو ہو جاتا ہے اور اس فعل کا وہ عقلی نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا جو قوانین عقلی کی رو سے ایسے افعال کے لیے مقرر کیا گیا ہے لیکن توبہ سے اس فعل کے طبیعی نتائج کا بدل جانا ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ جس طرح گناہ ایک امر عقلی ہے اسی طرح توبہ بھی ایک امر عقلی ہے قوانین طبیعی کے اعتبار سے گناہ کی حیثیت محض ایک حرکت کی ہے، اور حرکت سے اسباب طبیعی میں جو تحریک ہوتی ہے، وہ بہر حال اپنے طبیعی نتائج کی طرف منجر ہوتی ہے۔ توبہ سے اس تحریک میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوتا، اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص موقع پر خاص مصلحت سے اس کے لیے قوانین طبیعی میں کوئی جزئی ترمیم کر دے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ عالم عقلی کی طرح عالم طبیعی کا بھی حاکم مطلق ہے، اس لیے بسا اوقات وہ عالم طبیعت میں بھی امور عقلیہ کے مطابق تصرف کرتا ہے، مثلاً کسی قوم کے گناہوں پر اسے دنیا میں عذاب دینا، اور کسی نیک بندے کو ان نتائج سے بچا دینا جو اس کے فعل پر قوانین طبیعی کے تحت رونما ہونے چاہیے تھے اور کسی گناہ گار بندے کی توبہ کے بعد ان اثرات کو بھی زائل کر دینا جو قوانین طبیعی کی رو سے ظاہر ہونے والے تھے لیکن یہ سب کچھ حق تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگر وہ چاہے تو امور عقلیہ کی خاطر قوانین طبیعی میں ترمیم کر دے جس طرح حضرت ابراہیم یا قوم یونس کے لیے کی تھی، اور نہ چاہے تو نہ کرے، جیسا کہ ہم رات دن اہل خیر کو دنیوی مصائب میں مبتلا ہوتے اور اہل شر کو پھلتے پھولتے دیکھتے ہیں۔

جو کچھ بیان ہوا ہے، قرآن مجید کی بکثرت آیات اس پر شہادت دیتی ہیں۔ قرآن کی رو سے انسان اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے احکام و اوامر کا مخاطب اس حیثیت سے نہیں ہے کہ وہ ایک جسم نامی متحرک بالارادہ ہے، بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ وہ صاحب عقل و فکر اور قوت علمیہ سے بہرہ ور ہے۔ قلت

فَصَّلْنَا الْاٰیَاتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۶: ۱۲) کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیَاتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۱۰: ۳) وَکَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیَاتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۳۰: ۴) وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲: ۳۷) وَکَذٰلِکَ یُبَیِّنُ الْاٰیَاتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ (۲: ۲۷)

اس عقل و فکر کو خطاب کر کے جتنے امر و نہی کے احکام دیے گئے ہیں وہ سب امورِ عقلیہ ہیں، ان کے اتباع یا ان کی خلاف ورزی میں جتنے افعال انسان کرتا ہے، وہ بھی اس اعتبار سے عقلی افعال ہیں، اور ان پر ثواب و عقاب جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی ایک امر عقلی ہے۔ دیکھیے جو لوگ اللہ سے کفر کرتے ہیں اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان پر وہ غضبناک ہوتا ہے:۔

مَنْ شَرَحَ بِالْکُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ (۱۶: ۴) عَلَیْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَلَعَنَهُمْ (۴۸: ۱) اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ (۵۸: ۳) حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ (۴۲: ۲) اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْکُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ (۲۰: ۴) یہ کفر اور نافرمانی بھی عقلی ہے اور اس پر غضب بھی عقلی ہے۔

پھر جب اللہ کسی پر غضب ناک ہوتا ہے تو اس سے انتقام[1] لیتا ہے اور اسے سزا دیتا ہے:۔

وَمَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ (۵: ۱۳) فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا (۳۰: ۵) اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (۳۲: ۲) قَالُوْا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ کٰفِرُوْنَ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ

[1] لفظ انتقام کو لوگ نفسانی انتقام کے معنوں میں لیتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ لفظ سن کر کان کھڑے کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ انتقام عقلی ہے عقل و حکمت کا مقتضی یہ ہے کہ حکم کی خلاف ورزی پر حاکم ناخوش ہو اور اس کی سزا دے اور انجام کار میں نافرمان اور فرمانبردار برابر نہ رہیں۔ اسی چیز کی طرف قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ (۳۸: ۳)۔

(۴۳:۲) فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ (۴۳:۴) یہ انتقام کبھی تو صرف آخرت میں بشکل عذاب جہنم ہی ہوگا یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (۴۴:۲) اور کبھی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اسباب طبیعی سے کام لے کر ان قوموں پر بلائیں نازل کرتا ہے جن سے وہ انتقام لینا چاہتا ہے، فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (۷:۱۶) اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۱۵:۵) فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا (۲۹:۴)

ان آیات میں جن دنیوی عذابوں کا ذکر ہے وہ ان قوموں کی حرکات کے طبیعی نتائج نہ تھے، کیونکہ رسولوں کی تکذیب اور آیات الٰہی سے کفر وہ چیز نہیں جس پر قوانین طبیعی کے تحت آندھی اور سیلاب آئیں یا پتھراؤ ہو یا زمین دھنس جائے۔ اگر کسی خاص موقع پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو ان امور عقلیہ پر اسباب طبیعی بھی حرکت میں آجاتے ہیں لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ رات دن ہم دیکھتے ہیں کہ رسولوں کی تکذیب کی جاتی ہے اور آیات الٰہی سے کفر ہوتا ہے مگر ہر ایسے موقع پر سیلاب نہیں آتے۔ نہ پتھراؤ ہوتا ہے، نہ زمین دھنستی ہے، اس لیے کہ یہ افعال دراصل عقلی افعال ہیں، اور ان کا اصلی نتیجہ عقلی نتیجہ ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ اس دنیا میں ان کے برے نتائج کا ظہور ضروری نہیں ہے۔

اسی طرح توبہ (جو ایک امر عقلی ہے) کا بھی عقلی نتیجہ صرف یہ ہے کہ اللہ کا غضب جو گناہ پر بھڑک اٹھا تھا، فرو ہو جائے، اور انسان اس کی عقلی سزا (یا قرآن کی اصطلاح میں انتقام) سے معاف کر دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ اس فعل کے جو طبیعی نتائج قوانین طبیعی کے تحت مترتب ہونے والے تھے وہ بھی توبہ کے ساتھ ہی روک دیے جائیں، تو یہ ضروری نہیں ہے۔ اللہ جب چاہتا ہے تو کسی خاص مصلحت کی بنا پر ان کو روک بھی دیتا ہے، جیسا کہ قوم یونس کے حق میں اس نے کیا۔ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۱۰:۱۰) لیکن عموماً وہ عالم مادہ و اجسام میں امور عقلی

کی خاطر عادت مقررہ کو نہیں بدلتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ شراب کی عادت رکھنے کے بعد توبہ کر لیتے ہیں ان کے اعضاء رئیسہ کی خرابیاں توبہ کے ساتھ دور نہیں ہوتیں۔ البتہ وہ توبہ کی بدولت اس کی عقلی سزا سے حسب وعدۂ آلہی مصئون ہو جاتے ہیں۔

اب یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ آدم علیہ السلام نے جو فعل کیا تھا اس کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک نفس فعل ہونے کی حیثیت، یعنی شجر ممنوع کو چکھنا جس کا ایک طبعی نتیجہ مقرر تھا۔ دوسری اس کی حیثیت کہ وہ امر آلہی کے خلاف تھا ظلم اور گناہ تھا جس کا عقلی نتیجہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور انتقام کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیے تھا۔ حضرت آدم یہ فعل کرنے کے بعد اس کے طبعی اور عقلی دونوں نتائج کے مستحق ہو چکے تھے۔ مگر جب انھوں نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اس امر عقلی کی بنا پر اس فعل کے عقلی اثر کو زائل کر دیا، یعنی ان کی توبہ قبول کر کے ان کے گناہ کو معاف کر دیا، انھیں برگزیدگی کا شرف عطا کیا اور ان کو راہ راست کی طرف ہدایت عطا فرمائی۔ رہا ان کے فعل کا طبعی نتیجہ، تو وہ ظاہر ہوا۔ وہ اپنی بشری کمزوریوں کے ظاہر ہو جانے کے بعد قیام جنت کے لائق نہ رہے تھے اس لیے انھیں زمین پر اتار دیا گیا، اور جنت میں واپس آنے کے لیے شرط لگا دی کہ اپنے نفس پر غلبہ پاکر قیام جنت کا استحقاق ثابت کرو۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (۷۹:۲)

آپ کہتے ہیں کہ توبہ کا یہ اثر بھی کیوں نہ ہوا کہ ان کے فعل کا طبعی اثر بھی زائل کر دیا جاتا۔ لیکن یہ اللہ سے خرق عادت کا مطالبہ ہے جس کو پورا کرنے پر وہ مجبور نہیں۔ وہ یقیناً خرق عادت پر قادر ہے اور جب اس کی مصلحت کا اقتضا ہوتا ہے تو وہ اپنی اس قدرت کو ظاہر بھی کرتا ہے لیکن امور عقلیہ کی خاطر قوانین طبعی میں ترمیم کرنا ہمیشہ ضروری نہیں ہے، اور نہ مصلحت خاص کے بغیر وہ کبھی ایسا کرتا ہے بلکہ حضرت آدم کے معاملہ میں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مصلحت اسی کی مقتضی تھی کہ ان کے فعل کا طبعی

نتیجہ ہبوط کی صورت میں ظاہر ہوتا کیونکہ وہ جنت میں رہنے کے لیے نہیں بلکہ زمین کی خلافت کے لیے پیدا کیے گئے تھے اور کبھی نہ کبھی ان کا زمین پر اترنا ضروری تھا۔

غلامی کا مسئلہ | مولانا اسلم جیراجپوری نے اسیران جنگ کو غلام بنانے کے خلاف اس آیت سے استدلال کیا ہے:

حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ یہاں تک کہ جب ان کا زور توڑ لو تو ان کو قید کرلو۔ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (۴۷:۱)۔ پھر یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔[1]

اس آیت سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسیران جنگ کے حق میں دو ہی صورتیں قرآن نے تجویز کی ہیں۔ یا تو بلا کسی معاوضہ کے انھیں رہا کیا جائے یا معاوضہ لے کر لیکن رہا کرنے کا حکم قطعی ہے اور غلام بنا کر رکھنا کسی حال میں جائز نہیں۔

اب ہم کو تین حیثیتوں سے اس آیت پر نظر ڈالنی چاہیے:

اولاً یہ کہ آیت کے الفاظ سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

ثانیاً یہ کہ قرآن مجید کی دوسری آیات کی روشنی میں اس کی صحیح تفسیر کیا ہے۔

ثالثاً یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کیا مفہوم سمجھا اور کس طرح عمل کیا؟

آیت کا مفہوم | آیت میں مَنًّا اور فِدَآءً دونوں کے ساتھ لفظ اِمَّا آیا ہے، جو یا تو تخییر کے معنی میں ہے یا اباحت کے معنی میں یعنی اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ تمہیں اختیار ہے چاہے احسان کرو چاہے فدیہ لے لو، یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے لیے احسان کرنا بھی جائز ہے اور فدیہ لینا بھی۔ اس سے کسی طرح بھی حصر کا مفہوم نہیں نکلتا کہ تم ان دونوں صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ حکم قطعی تو صرف اس حد تک تھا کہ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ یعنی جب کفار سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو انکی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم ان کو خوب مار چکو اور ان میں مقابلے کی طاقت باقی نہ رہے تو بقیۃ السیف لوگوں کو باندھ لو۔ اس حکم کے بعد مسلمانوں کو اختیار دیا جاتا ہے یا ان کو بتا

[1] ترجمہ خود مولانا اسلم جیراجپوری کا ہے

کیا جاتا ہے کہ چاہیں قیدیوں کے ساتھ احسان کریں، چاہیں فدیہ لیں۔

اس کے بعد لفظ مَنّ قابل غور ہے۔ مَنّ کے معنی صرف احسان کے ہیں "احسان رکھ کر چھوڑ دو" مترجم کا اپنا اضافہ ہے۔ اگرچہ احسان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے لیکن ایک صورت یہ بھی تو ہے کہ قید کی حالت میں ان کے ساتھ احسان کا برتاؤ کیا جائے۔ اس صورت کی نفی "اور صرف رہائی میں مفہوم احسان کا انحصار" کہاں سے نکلتا ہے۔ اگر قرآن میں کوئی لفظ یا اشارہ ایسا ہے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ احسان سے مراد صرف رہا کر دینا ہے، تو براہ کرم اس کو بیان کیا جائے۔

قرآن مجید کی دوسری آیات | اب تلاش کیجیے کہ قرآن میں کونسی آیت ایسی ہے جس میں یہ حکم ہو کہ قیدیوں کو مطلقاً رہا کرنے یا فدیہ لے کر چھوڑنے کے سوا کوئی تیسری صورت جائز نہیں ہے اور ان کو غلام بنا کر رکھنا حرام ہے۔ یقیناً ایسی کوئی آیت آپ پیش نہیں کر سکتے۔ برعکس اس کے لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق بکثرت احکام آپ کو قرآن میں ملتے ہیں جو مذکورۂ بالا آیت کے بعد نازل ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کے احکام کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت تک رہائی کا حکم قطعی نہیں آیا تھا اس لیے لونڈی غلاموں کا رکھنا جائز تھا اور ان کے متعلق احکام بھی آئے تھے لیکن بعد کی آیات کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ اس آیت کا جو مفہوم آپ لے رہے ہیں اس کی رو سے تو یہ آیت نازل ہوتے ہی تمام لونڈی غلام رہا ہو جانے چاہییں تھے۔ مگر بعد کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رہا نہیں ہوئے، اور ان کے متعلق اسی طرح احکام آتے رہے جس طرح پہلے آتے تھے۔

آیت مذکورہ سورۂ محمد کی ہے جس کا کچھ حصہ مکہ میں اترا ہے، اور کچھ حصہ مدینہ طیبہ کے ابتدائی زمانہ میں۔ ابن عباسؓ نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کا مطلب یہ ہے کہ جب جنگ بدر کے روز کفار سے تمہارا مقابلہ ہو"۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس کی تائید قرآن مجید کی یہ آیت کرتی ہے۔ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ اِلٰی اٰخِرِ الْاٰیَۃ (۹:۸)
یہ آیت جنگ بدر کے قیدیوں کے حق میں نازل ہوئی ہے اور سال میں جو عتاب نازل ہوا ہے وہ صاف اشارہ کرتا ہے

کہ سورۂ محمد والی آیت میں شدّ وثاق سے پہلے اثخان فی الارض کا جو حکم دیا گیا تھا، اس پر پورا پورا عمل درآمد نہ کرنے کی وجہ سے عتاب فرمایا گیا پس متحقق ہو گیا کہ سورۂ محمدؐ کی یہ آیت سنہ ۲ھ میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

اب ملاحظہ ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان لونڈیوں کو جائز کیا جاتا ہے جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئی ہوں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ (۳۳: ۶)

اے نبی ہم نے تمہارے لیے حلال کی ہیں تمہاری وہ بیبیاں جن کے تم نے مہر ادا کیے ہیں اور وہ لونڈیاں جو خدا نے تم کو جنگ میں بطور غنیمت دلوائی ہیں۔

اس آیت میں ما ملکت یمینک سے مراد لونڈیاں ہیں، اور لونڈیوں کی تعریف مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ (جو اللہ تعالیٰ نے تم کو لڑائی میں بطور غنیمت دلوائی ہوں) سے کی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بدر سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فے عطا نہیں کیا تھا۔ لہٰذا بدر کے بعد لڑائیوں میں جو عورتیں مسلمانوں کے پاس قید ہو کر آئیں انہی کو لونڈیاں بنا کر رکھنا قرآن مجید نے جائز قرار دیا تھا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ (۳۳: ۶)

اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ یہ کہ ان کو بدل کر دوسری بیبیاں کر لو، اگرچہ تم کو ان کا حسن پسند آئے مگر لونڈیاں حلال ہیں۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی ہے جب ازواج مطہرات کی تعداد گیارہ تک پہنچ چکی تھی حضورؐ کا آخری نکاح سنہ ۷ھ کے خاتمہ پر ہوا ہے لہٰذا اس آیت کے نزول کا زمانہ سنہ ۸ھ سمجھنا چاہیے یہاں پھر ما ملکت یمینک کی تحلیل موجود ہے۔

سنہ ۸ھ کے اواخر میں غزوہ اوطاس ہوا بہت سی عورتیں پکڑی ہوئی آئیں ان میں جو بیاہی ہوئی عورتیں تھیں ان کے معاملے میں مسلمان متردد ہوئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (۴: ۴)

تمہارے لیے بیاہی ہوئی عورتیں حرام ہیں، مگر وہ عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر تمہارے ہاتھ آئیں

سورۂ نساء کے پہلے رکوع میں ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ( )

اور اگر تم کو خوف ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان سے نکاح کر لو دو دو تین تین چار چار۔ اور اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کر دیا جو لونڈی تمہارے قبضہ میں ہو۔

یہ حکم سنہ۳ھ اور سنہ۴ ہجری کے درمیان کا ہے۔ ان مختلف احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً سے قرآن مجید کا مقصد وہ نہ تھا جو مولانا اسلم جیراجپوری نے سمجھا ہے۔ ورنہ اس آیت کے نزول کے بعد لونڈیوں کا رکھنا سرے سے ممنوع ہو جاتا نہ کہ اس کی اجازت دی جاتی اور ان کے متعلق احکام دیے جاتے۔

ایک نکتہ اس سلسلہ میں مولانا اسلم جیراجپوری نے ایک لطیف نکتہ بھی بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ قرآن میں جہاں جہاں مملوکوں کا ذکر ہے بصیغۂ ماضی یعنی ما ملکت ایمانکم ہے بصیغۂ مستقبل کہیں نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن غلاموں کے وہ مالک ہو چکے تھے صرف انہی کی ملکیت قائم رکھی گئی تھی" اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن میں جو احکام بصیغۂ ماضی ارشاد ہوئے ہیں وہ مستقبل کے لیے نہیں ہیں مثلاً گیلڑ لڑکیاں اپنے سوتیلے باپوں کے لیے جس آیت میں حرام کی گئی ہیں اس کے الفاظ یہ ہیں وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ (۴: ۴) یہاں دَخَلْتُمْ صیغۂ ماضی ہے لہٰذا صرف ان عورتوں کی بیٹیاں حرام ہوئیں جو نزول آیت سے پہلے مسلمانوں کے نکاح میں آ چکی تھیں۔ آیندہ کے لیے یہ حکم نہیں ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ (۸: ۵) اس میں بھی خمس کا حکم صرف ماضی کے لیے ہے۔ بعد کے غنائم میں خمس نہیں ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ (۶۲: ۲) اس میں جمعہ کی نماز کا حکم بھی ان لوگوں کے لیے تھا جو اس وقت ایمان لا چکے تھے۔ بعد کے مسلمان اس حکم سے بچ گئے۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (۴۲:۲)

میں صرف ان اختلافات کا فیصلہ احکام الٰہی کی رو سے کرنے کا حکم ہے جو پہلے واقع ہو چکے تھے۔ بعد کے اختلافات میں حکم الٰہی کی طرف رجوع کرنا ضروری نہ ہوگا۔ غرض جناب مولانا نے یہ ایسا نکتہ نکالا ہے جو آج تک کسی کو نہ سوجھا تھا۔ ورنہ ابتک مسلمان ان بہت سے احکام کی بندشوں سے آزاد ہو چکے ہوتے جو بصیغۂ ماضی دیے گئے تھے، اور جن میں اللہ میاں نے (نعوذ باللہ) شاید بے احتیاطی کی بنا پر استقبل کا صیغہ استعمال نہ کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح تو کافروں اور آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کے لیے بھی آتش دوزخ سے رہائی مل جاتی کیونکہ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ (۱:۶۴) میں کفروا اور کذبوا دونوں ماضی کے صیغے ہیں۔ لہذا بعد کے تمام کفار و مکذبین اس وعید سے بچ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ آفرینی معنوی تحریف کی حد تک پہنچتی ہے۔ قرآن مجید کے معانی میں ایسی تحریف کرتے ہوئے ایک مسلمان کا ایمان لرز جانا چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً اور مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کا کیا مفہوم سمجھا، اور اس پر کس طرح عمل کیا۔

بنی قریظہ کے حق میں حضرت سعد بن معاذ نے فیصلہ کیا کہ ان کے بالغ مرد قتل کیے جائیں اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ کو نافذ فرمایا۔

خیبر کی جنگ میں بہت سی عورتیں گرفتار ہوئیں اور وہ مسلمانوں میں تقسیم کی گئیں۔ ام المومنین حضرت صفیہؓ انہی عورتوں میں سے تھیں۔

غزوۂ حنین میں ۶ ہزار عورتیں اور بچے قید ہوئے بعد میں ہوازن کا وفد حاضر ہوا اور اس نے سبایا کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ آنحضرت نے فرمایا کہ جو میرے اور بنی عبدالمطلب کے قبضہ میں ہیں ان کو میں احسان کے طور پر رہا کرتا ہوں۔ مگر دوسروں کے معاملہ میں حکم دینے کا مجھے حق نہیں۔ صرف سفارش کر سکتا ہوں۔ چنانچہ حضور کی سفارش پر انصار اور مہاجرین نے اپنے اپنے حصے کے سبایا کو چھوڑ دیا۔ مگر

بنو تمیم اور بنو فزارہ اور بنو سلیم کے نمایندوں نے انکار کیا۔ آخر کار حضور نے ان سے وعدہ کیا کہ بعد کی لڑائیوں میں جو سبایا ہاتھ آئیں گے ان میں سے ہم تمکو ایک ایک کے بدلے چھ چھ دیں گے۔ تب وہ ہوازن کے قیدیوں کو چھوڑنے پر راضی ہوے۔

اوطاس کے سبایا کا اوپر ذکر ہو چکا ہے جن کے حق میں خود قرآن مجید کی آیت وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ نازل ہوی۔

اس میں شک نہیں کہ حضور نے بعض مواقع پر قیدیوں کو احسان کے ساتھ رہا بھی کیا ہے کبھی قیدیوں کا مبادلہ بھی کیا ہے، اور کبھی زر فدیہ لے کر بھی چھوڑ دیا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کے عہد میں بکثرت قیدی لونڈی غلام بنا کر بھی رکھے گئے ہیں۔ اور ان کو مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کیا قرآن مجید کے احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سمجھنے والا اور ان کے مطابق عمل کرنے والا کوئی اور ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو ایسا سمجھتا ہے تو سمجھنے دیجیے اس کا معاملہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ نہیں ہے، اور وہ اسی قانون کو برحق سمجھتے ہیں جو اللہ کے رسول نے اپنے قول و عمل سے بنا دیا ہے۔ (باقی)

مکتبہ علمیہ

سلطنت آصفیہ میں ایک ایسا مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جو خاموشی کے ساتھ اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے اور جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم و فن کی اردو عربی فارسی اور انگریزی کتب اور ان کے تراجم مل سکتے ہیں طلبا کے لیے درسی کتب کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمایش کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں جو مصنفین و مولفین حیدرآباد میں اپنی تصنیفات کی اشاعت اور ان کی فروخت کا معقول انتظام چاہتے ہوں وہ مہتمم مکتبہ سے ذریعہ خط و کتابت جملہ امور کا تصفیہ فرما سکتے ہیں حیدرآباد کے مشہور اور نامور شعرا اور مصنفین کی تصانیف آپ کو مکتبہ سے مل سکتی ہیں آج ہی ایک کارڈ لکھ کر فہرست مفت طلب ——— **مالک خواجہ بہاؤالدین صاحب مکتبہ علمیہ چار مینار حیدرآباد دکن** ——— فرمایئے

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہو گی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کیلیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں۔ لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)
مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن

آپ کا کتب خانہ

کون کون سی کتابوں سے خالی ہے

اس کا جواب ان الماریوں سے ملے گا جن میں آپ کی کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ نئی دنیا پرانے نظریوں کے متعلق کیا رائے رکھتی ہے اس کے مصنفین ہمارے سامنے کیا نئی باتیں پیش کر رہے ہیں۔ شاہ راہ ترقی پر کون کس سے آگے ہے اور پہلے کہاں تھا؟ ان تمام سوالات کے جواب آپ کو اپنے کتبخانہ سے ملنے چاہئیں۔ مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آپ اپنے ذخیرہ پر پوری توجہ رکھیں اپنے کتب خانہ کی تکمیل کیلئے ہمارے کتبخانہ کو لکھیے۔ جہاں عربی، فارسی اور خصوصاً اردو زبان کی تمام علمی، ادبی، تاریخی وفنی جدید و قدیم تصنیفات نہایت تلاش اور جستجو سے مہیا کی جاتی ہیں اور اکثر کمیاب قدیم تصانیف نہایت اہتمام سے خود طبع کرا کر پیش کی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں درسی کتابیں منظور شدہ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی از انفنٹ تا بی۔ اے کلاس بزبان عربی فارسی۔ اردو انگریزی مرہٹی تلگو کنڑی وغیرہ نیز کنڈرگارٹن، ڈول کے سٹ و نقشہ جات دیواری رنگین ہر قسم کے چارٹس اسباق الاشیا وغیرہ مدارس کے اور دیگر دفاتر کے فارمس اور ڈرائنگ کا سامان بالکل

واجبی قیمتوں پر حاصل کیجیے

سید عبدالقادر تاجر کتب

و مالک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر چار مینار حیدرآباد دکن